لسانیات، زبان اور رسم الخط
ڈاکٹر اشرف کمال

Sidra Zahir

لسانیات، زبان اور رسم الخط

ڈاکٹر اشرف کمال

مثال پبلشرز
رحیم سینٹر، پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد

اشاعت : 2012ء

کتاب : لسانیات، زبان اور رسم الخط

مصنف : ڈاکٹر اشرف کمال (ایسوسی ایٹ پروفیسر)
صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج، بھکر
موبائل: 0333-6842485

ناشر : محمد عابد

تزئین : اخلاق حیدر آبادی

قیمت : 300روپے

مطبع : بی پی ایچ پرنٹرز، لاہور

Lisaniyat, Zaban or Rasmulkhat

by

Dr. Ashraf Kamal

Edition - 2012

اہتمام

مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار، فیصل آباد

Ph:2615359 -2643841 Mob:0300-6668284
E-mail:misaalpb@gmail.com

شوروم

مثال کتاب گھر، صابریہ پلازہ، گلی نمبر 8، منشی محلہ، امین پور بازار، فیصل آباد

Cell: 0300-7980300
E-mail:misalkitabghar@gmail.com

انتساب

(تمغۂ امتیاز)

پروفیسر ڈاکٹر طاہر تونسوی

(ڈین، فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ)

گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد

کے نام

تصانیف

- پھول راستے (شعری مجموعہ) ۱۹۹۲
- دھوپ کا شہر (شعری مجموعہ) ۱۹۹۵
- تجھے دیکھا ہے جب سے (شعری مجموعہ) ۲۰۰۷
- کوئی تیرے جیسا نہیں (شعری مجموعہ) ۲۰۱۰
- انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی کی مطبوعات — توضیحی کتابیات ۲۰۰۶
- لسانیات، زبان اور رسم الخط ۲۰۰۹
- اُردو ادب کے عصری رجحانات کے فروغ میں افکار کراچی کا کردار ۲۰۰۹

  انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی
- تیس سالہ اشاریہ مضامین اخبارِ اُردو، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۲۰۱۰
- حافظ محمود شیرانی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۲۰۱۱
- پنجابی زبان گرومکھی رسم الخط اور بنیادی معلومات ۲۰۱۱

  (بہ اشتراک اخلاق حیدرآبادی) شعبۂ اُردو، جی۔سی۔ یونیورسٹی، فیصل آباد

زیرِ ترتیب

- قائداعظم اور اُردو
- اشاریہ اور فنِ اشاریہ سازی
- تاریخِ اصنافِ ادبِ اُردو
- اقبال اور اُردو
- بابائے اُردو مولوی عبدالحق — فن اور شخصیت
- انجمن ترقی اُردو کے تراجم
- امریکہ، برطانیہ اور کینیڈا کے اُردو تخلیق کار

فہرست

زبان — تعریف، ابتدا اور ارتقا

اگر انسان اور انسانی حیات کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہ اپنے بچپن سے لے کر لڑکپن، جوانی، بڑھاپے اور اپنی عمر کے آخری لمحے تک زبان کا کسی نہ کسی صورت میں استعمال عمل میں لاتا ہے۔ بچے کو جب کھانے پینے کی حاجت ہوتی ہے تو وہ بول کر اپنا مدعا اس طرح بیان نہیں کرسکتا جیسا کہ بڑے کر سکتے ہیں مگر اس کے باوجود وہ ہاتھوں، ٹانگوں اور جسم کی مختلف حرکات کے ساتھ اپنی زبان سے لایعنی الفاظ بول کر قریب بیٹھے ہوؤں کو اپنی جانب متوجہ کر لیتا ہے وہ مختلف حاجات اور ضروریات کے لیے مختلف لسانی اشاروں سے مدد لیتا ہے۔ ان لسانی اشاروں کو ماں بخوبی سمجھتی ہے اور ماں کے لسانی اشارے بچہ بھی سمجھنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روتے ہوئے بچے کو ماں لوری یا تھپکی سے چپ کرا سکتی ہے یا اسے سلا سکتی ہے۔ یہاں لوری اور تھپکی کے ذریعے زبان کا عمل اپنی تفہیم کی منازل طے کرتا ہے۔ بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ وہ مختلف چیزوں کو خود اپنے طور پر مختلف نام دینے لگتا ہے جو بہت بعد میں ان ناموں سے تبدیل ہوتے جاتے ہیں جو کہ ہمارے معاشرے اور ہماری زبان میں رائج ہیں۔ اگر ہم غور کریں تو زبان انسان کی نشوونما اور اس کی ذہنی وفکری ارتقا اور جسمانی بالیدگی کے ساتھ ساتھ پنپتی اور ارتقائی مراحل طے کرتی ہے۔ لیکن اس پر ماحول اور سماج کے اثرات

بہت گہرے ہوتے ہیں بچہ وہی زبان سیکھتا ہے جو اس کے اردگرد بولی جا رہی ہوتی ہے۔

معاشرے کا ہر فرد زبان کو اپنے دائرے اور وسعتِ علمی کے مطابق استعمال کرتا ہے اگر اس کا کام اور واسطہ عام لوگوں سے ہے تو اس کی زبان اور الفاظ بھی عام لوگوں کی زبان اور الفاظ سے مطابقت رکھتے ہوں گے اور اگر وہ کسی مخصوص ادارہ، طبقہ یا گروہ سے تعلق رکھتا ہے تو وہ اپنے شعبہ کے حوالے سے زبان اور الفاظ کا استعمال کرے گا۔ ادبیات سے تعلق رکھنے والے شخص کی سوچ، فکر اور بات چیت سائنس کے کسی شعبے سے وابستہ فرد کی زبان اور زبان کے استعمال کے طریقے سے کسی حد تک مختلف ہو گی۔

اسی طرح اگر کوئی فرد ان پڑھ ہے تو وہ زبان کو پڑھے لکھے لوگوں سے مختلف انداز میں استعمال کرے گا۔ زبان ہر شخص اور ہر شعبۂ حیات اور مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی ذہنی مشق کے لیے اسی طرح ضروری ہے جیسا کہ پھول کے کھلنے اور پھلنے پھولنے کے لیے روشنی اور ہوا۔ جس طرح پھول کی خوشبو ہوا کے دوش پر اپنے وجود کا اظہار کرواتی ہے اسی طرح انسان اپنی شخصیت، ذہانت و اہلیت کی ترجمانی کے لیے زبان کا وسیلہ استعمال کرتا ہے۔

زبان انسان اور حیوان میں امتیاز پیدا کرتی ہے۔ انسانوں کے لیے زبان اسی طرح اہم ہے جس طرح جسم کے لیے آکسیجن۔ زبان کا بہتر استعمال انسان کی ترقی اور شعور کے مدارج کے ارتقا میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ فصیح زبان وہ ہے جو ماضی میں بڑے ادیب استعمال کرتے رہے ہیں اور زبان کے صحیح ہونے کی سند قدما سے لی جاتی ہے۔

زبان کی تاریخ، تاریخ انسانی کی طرح قدیم ہے۔ زبان کا آغاز کب اور کہاں سے ہوا؟ اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ انسان، زندگی اور معاشرے سے زبان کا گہرا تعلق ہے۔ تمام تر سائنسی و معاشرتی ترقی کا دارومدار زبان ہی پر ہے۔ زبان وہ ذریعہ ہے جس کی مدد سے ہم نہ صرف اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں بلکہ اس کے ذریعے سوچتے اور غور و فکر بھی کرتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ ہم اپنی سوچ خیالات و افکار اور نظریات تحریری زبان کے ذریعے محفوظ بھی کر سکتے ہیں۔

ماہرین لسانیات اور لغت نگاروں نے زبان کی مختلف تعریفیں پیش کی ہیں۔ان میں کوئی بھی تعریف حتمی نہیں ہے بلکہ اس میں اضافہ اور تبدیلی ممکن ہے۔

منہ میں بتیس دانتوں کے درمیان گوشت کے ٹکڑے کو فارسی میں زبان، عربی میں لسان، انگریزی میں ٹنگ اور اردو میں اسے جیبھ کہا جاتا ہے۔

نوراللغات میں زبان کی درج ذیل تعریف کی گئی ہے:

''جیبھ۔بول چال۔روزمرہ

وہ بولی جس کے ذریعے انسان اپنے دل کی بات ظاہر کرسکے۔''(۱)

بابائے اردو مولوی عبدالحق اردو انگریزی لغت میں درج ذیل انگریزی کے الفاظ میں تعریف بیان کرتے ہیں:

زبان(P)Zaban: Tongue,Language

Way of expression

promise, flame, sword [2]

یعنی زبان ذائقہ کی حس رکھنے والے عضو اور نطق کے آلے کو کہتے ہیں۔

شان الحق حقی زبان کی تعریف میں درج ذیل جملے لکھتے ہیں:

''زُبان۔منہ کے اندر ذائقہ چکھنے اور بولنے میں حرکت کرنے والا عضو،

جیبھ۔بولی۔لسان (محاورہ)۔قول۔اقرار

کسی طبقے کا مخصوص محاورہ''(۳)

اردو لغت میں زبان کی تعریف یوں کی گئی ہے:

''زُبان: منہ کے اندر کا وہ عضو جس میں قوت ذائقہ ہوتی ہے اور جو نطق کا ذریعہ ہے۔

جیبھ

بولی: جس کے ذریعے انسان تکلم یا تحریر کی صورت میں اپنے خیالات اور جذبات ظاہر کرتا ہے۔

بول چال۔روزمرہ۔بات۔قول۔''(۴)

جامع اللغات میں زبان کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

''زبان: گوشت کا سرخ ٹکڑا جو منہ میں ہوتا ہے۔ اس میں قوت ذائقہ ہوتی ہے اور انسان اس کے ذریعہ بولتا ہے۔

جیبھ۔ لسان

بولی: جس سے انسان اپنے خیالات اپنے جذبات کو ظاہر کرتا ہے۔

بول چال۔ روزمرہ''(۵)

اصطلاحی حوالے سے زبان سے مراد وہ صلاحیت ہے جس کی مدد سے انسان اپنے ذاتی اجتماعی معاملات کے لیے اپنے ماحول اور معاشرتی حالات تقاضوں کے مطابق لکھ کر یا بول کر آواز یا علامات کی صورت میں اظہار کر سکے۔ یعنی زبان بامعنی آوازوں اور حروف وعلامات پر مبنی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم فارانی زبان کی تعریف کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''زبان وہ بامعنی آوازیں یا علامتیں ہیں جن کی وساطت سے انسان بصورت تقریر یا بصورت تحریر اپنے خیالات کا اظہار کرتا اور دوسروں سے بذریعہ سماع یا مطالعہ معلومات اخذ کرتا ہے اسی لیے زبان کو تبادلہ خیالات اور اظہار خودی کا آلہ کہا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے تمام حروف اور تمام الفاظ یا الفاظ کے مجموعے (مرکبات) جو تحریر یا تقریر میں استعمال ہوتے ہیں زبان کے دائرے میں داخل ہیں۔ اور زبان کے عناصر سمجھے جاتے ہیں۔''(۶)

ڈاکٹر محی الدین قادری زور زبان کی تعریف کرتے آوازوں کے ساتھ ساتھ مختلف جسمانی حرکات وسکنات کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ وہ زبان کی تعریف کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''زبان خیالات کا مجموعہ ہے اس کا کام یہ ہے کہ لفظوں اور فقروں کے توسط سے انسانوں کے ذہنی مفہوم و دلائل اور ان کے عام خیالات کی ترجمانی کرے۔ اس ترجمانی میں وہ حرکات جسمانی بھی شامل ہیں جو کسی مفہوم کے سمجھانے کے لیے خاص خاص زبان بولنے والوں کے

درمیان مشترک ہوتی ہیں۔۔۔پس زبان کی واضح تعریف ان الفاظ میں کی جاسکتی ہے کہ ”زبان انسانی خیالات اور احساسات کی پیدا کی ہوئی ان تمام عضوی اور جسمانی حرکتوں اور اشاروں کا نام ہے جن میں زیادہ تر قوت گویائی شامل ہے اور جن کو ایک دوسرا انسان سمجھ سکتا ہے اور جس وقت چاہے اپنے ارادے سے دہرا سکتا ہے۔“(۷)

برجموہن دتاتریہ کیفی زبان کی تعریف کے بارے میں لکھتے ہیں:

”زبان تخیل اور خیال کے ظاہر کرنے یا مطلب ادا کرنے کا ذریعہ ہے۔۔۔ہمارا مقصد ناطقہ کے ذریعہ اظہار خیال سے ہے جس کا تعلق آواز سے ہے۔“(۸)

ڈاکٹر اقتدار حسین خان ریڈر شعبہ لسانیات مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ نے اپنی کتاب ’لسانیات کے بنیادی اصول‘ میں زبان کی تعریف درج ذیل الفاظ میں بیان کی ہے:

”لسانیات کی رو سے زبان ایک ایسے خود اختیاری اور روایتی صوتی علامتوں کے نظام کو کہتے ہیں جو کوئی انسان اپنے سماج میں اظہارِ خیال کے لیے استعمال کرتا ہے۔“(۹)

زبان آوازوں کا مجموعہ ہے۔ بنیادی طور پر بول چال کو کہا جاتا ہے۔ تحریر اس کا ثانوی اور ملفوظی روپ ہے۔ زبان ایک ایسی تغیر پذیر شے ہے جو کہ اپنا ایک الگ نظام رکھتی ہے۔ زبان میں صوت حرف پر مقدم ہے۔ لیکن ہمارے یہاں حرف ہی کو مقدم سمجھا جاتا رہا ہے اور زبان کی ہر بحث میں حرف ہی کو بنیاد بنایا جاتا رہا ہے۔

زبان کے حوالے سے درج ذیل چند باتیں اہمیت کی حامل ہیں:

الف۔ زبان ایک نظام ہے جسے اعلیٰ حیوانات (یعنی انسان) اور یا کمپیوٹر باہمی ابلاغ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن یہ صرف ابلاغ ہی تک محدود نہیں ہے۔ زبان کا مسئلہ ہمارے دور کا مرکزی مسئلہ بنتا جا رہا ہے۔

ب۔ زبان صرف آوازوں ہی کا نام نہیں۔ زبان کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ آوازوں

نہیں ہوسکتی۔[۱۲] زبان انسان کی ابتدائی ایجاد تھی جس سے بے شمار اختراعوں کا آغاز ہوا اس
نے انسان کو ایک ایسی ترقی کی طرف گامزن کیا جس نے انسانی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔
انسان نے زبان کی مدد سے اپنے تخیلات کو الفاظ کا قالب عطا کیا۔

بقول شان الحق حقی:

"انسان کے تخیل نے زبان کی کوتاہیوں کے باوجود اسی ناقص وسیلے سے کام لے کر بہت جولانیاں دکھائیں اور ایک عظیم سرمایۂ ادب پیدا کر دیا، حتیٰ کہ انسانی علم نے بھی اسی مخدوش، کڈھب اور نامعتبر ذریعۂ اظہار سے کام لیا۔ اگر ہندسہ ایجاد نہ ہوا ہوتا تو شاید زبان فلسفے اور سائنس کا اتنا ساتھ نہ دے سکتی۔ یہ ساری ترقی زبان کی اندرونی خامیوں کے باوجود عمل میں آئی۔ حیرت ہے کہ زبان، جو انسان کا سب سے کثیر الاستعمال آلہ تھا، جس کو زیادہ سے زیادہ باضابطہ، محکم، صحیح اور بے عیب بنانے کی ضرورت تھی، ایسا نہ بن سکا۔"[۱۳]

زبان انسان کا وہ وسیلۂ اظہار ہے جس کے بغیر وہ تمدن اور ادب وثقافت کے میدان میں موجودہ ترقی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ زبان صرف ادب ہی کے لیے نہیں بلکہ سائنس، قانون، صحت تعلیم، تہذیب وتمدن، معیشت ومعاشرت ہر شعبۂ حیات کو محیط ہے۔

زبان کو مختلف شکلوں اور نشانات کے علاوہ اور بھی کئی ذرائع سے دوسروں تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ مثلاً ابھار اور اتار کے ذریعے۔ یہ وسیلہ نابیناؤں کے لیے تحریروں میں استعمال ہوتا ہے۔ ہوا کے دباؤ میں کمی بیشی کے ذریعے۔ یہ وسیلہ بعض ایسے آلات میں استعمال ہوتا ہے جو بہروں کی باہمی گفتگو کے لیے کام میں آتے ہیں۔ اسی طرح گراموفون ریکارڈنگ، ٹیپ اور کمپیوٹر ڈسک میں ان سب سے مختلف ہائے زبان مختلف سانچوں میں ڈھلی اور ان سانچوں کے نمونوں میں چھپی ہوتی ہے۔۔ لہٰذا جب زبان کو وسیلے سے ممتاز کیا جاتا ہے تو گویا نمونے کو اس کے مادی جسم سے ممیّز کیا جاتا ہے نمونہ اپنے مادی جسم سے بے نیاز ہوتا ہے دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ زبان ہیئت ہے اور وسیلہ مواد۔[۱۴]

زبان کی ابتدا اور آغاز کے بارے میں اندازے لگائے جاتے رہے ہیں مگر اس بارے میں وثوق سے کچھ کہنا کہ زبان کہاں، کب اور کیسے وجود میں آئی ممکن نہیں۔ جین اچی سن (Jean Aitchison) زبان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"Language probably developed in east Africa, around 100,000 years ago. Three preconditions must have existed. First, humans had to view the world in certain common way: theynoticed objects and action, for example. Second, they were able to produce a range of sounds - a spin-off of walking upright, according to one view. Third, they have attained the 'naming insight' ,the realization that sound sequences can be symbols which 'stand for' people and object."[15]

یعنی ایک لاکھ سال پہلے زبان نے مشرقی افریقہ میں اپنی ترقی یافتہ شکل کی طرف باقاعدہ سفر شروع کیا۔

رگ وید کی زبان کو سب سے قدیم مانا جاتا ہے۔ رگ وید کے متعلق میکس مولر (Max Muller) کا خیال ہے کہ یہ ۱۲۰۰ سال قبل مسیح تخلیق ہوئی تھی۔ ڈاکٹر ونٹر منز (Winter mitz) نے اس خیال کی تردید کی اور اس کے مطابق اس کی تخلیق تین ہزار سال قبل مسیح ہوئی تھی۔ رگ وید وہ قدیم کتاب ہے جس سے آریوں کی زندگی کی حقیقتیں معلوم ہوتی ہیں۔ رگ وید کی زبان میں اپج ہے، انفرادیت اور وسعت ہے، ڈکشن ہے، تناؤ، لچک اور فنکاری ہے۔ قواعد کے ہر پہلو سے یہ قدیم بولی سنسکرت سے الگ ہے۔ لہجہ اور الفاظ کی بناوٹ کے لحاظ سے اس بولی کی اپنی خاص اہمیت ہے۔ رگ وید کے مطالعہ کے بغیر زبان کی تاریخ کے ارتقا پر روشنی نہیں پڑ سکتی۔ رگ وید میں ان لوگوں کو داسا کہا گیا جن سے آریہ کو لڑنا پڑا۔ رگ وید کے زمانہ میں کوالاریوں اور دراوڑیوں کا وجود نہیں تھا رگ وید میں جن لوگوں کو سیاہ فام کہا گیا وہ سیاہ اور کالے لوگ آریوں ہی میں سے تھے جو ویدک منتروں پر اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔

دیوتاؤں پر انھیں اعتبار اور یقین نہیں تھا آریوں نے ان سے نفرت کی۔ بعض ماہرین کہتے ہیں کہ چھٹی صدی قبلِ مسیح فن تحریر سے لوگ واقف تھے اشوک کے کتبہ سے یہ حقیقت معلوم ہوجاتی ہے کہ عوام میں تعلیم عام تھی۔ موہنجوداڑو کے رسم الخط کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے لوگ فن تحریر سے آگاہ تھے۔ اس حوالے سے برہمی رسم الخط بھی اہم ہے۔ قدیم ہندوستان میں لوگ پتوں پر لکھتے تھے۔ پتوں کی تراش خراش ان کے دھوپ میں سوکھ جانے کے بعد ہوتی تھی۔ ایک خاص قسم کی روشنائی سے لکھنے کے بعد دھاگے کی مدد سے انھیں ایک جگہ کیا جاتا تھا پھر کتاب تیار ہوجاتی تھی۔ لکڑی اور تانبہ سے اس سلسلہ میں مدد لی جاتی تھی۔ ونٹرمنز کا خیال ہے کہ رسم الخط ہندوستان میں باہر سے آیا تھا اور اس کا تعلق وہ فونیشنس (Phoenicians) رسم الخط سے جوڑتے ہیں وہ اس بات کا بھی فیصلہ سنا دیتے ہیں کہ ہندوستان میں ملنے والا برہمی رسم الخط کا تعلق اس رسم الخط سے ہے جو میسا کے پتھر (stone of Mesa) پر ملتا ہے۔(۱۶)

دنیا کی زبانوں کے مختلف گروہ

زبان کے مطالعہ نے جب سے سائنس کی حیثیت اختیار کی ہے اس وقت سے زبان کا علم رکھنے والے ماہرین نے دنیا بھر کی زبانوں کے حوالے قابل قدر کام کیا ہے۔ چونکہ زبان کے ارتقا اور تاریخ کا تعلق انسان کے ارتقا اور تاریخ سے ہے۔ تو جس طرح انسان کی تاریخ قدیم ہے اسی طرح زبان کی تاریخ بھی بہت پرانی ہے۔ انسان اپنی پیدائش کے بعد سے لے کر آج تک مختلف زبانیں بولتا چلا آرہا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ جہاں کئی پرانی زبانیں معدوم ہوچکی ہیں یا ان میں تبدیلیاں وقوع پذیر ہوچکی ہیں وہاں نئی زبانوں کی دریافت کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ ابھی تک ہم اس بات کا دعویٰ نہیں کرسکتے کہ ہمارے ماہرین لسانیات کا مطالعہ دنیا میں بولے جانے والی تمام زبانوں کا احاطہ کرچکا ہے۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ زبانیں چاہے قدیم ہوں یا جدید وہ مسلسل مختلف لسانی تغیرات سے دوچار رہتی ہیں۔ کچھ زبانیں ترقی یافتہ ہیں جن کے ذریعے سائنس وٹیکنالوجی اور علم وادب

نے خوب ترقی کی ہے، کچھ زبانیں ایسی ہیں جو صرف بول چال ہی کی حد تک موجود ہیں۔ ان میں لکھائی پڑھائی کا چلن عام نہیں۔

جس طرح دنیا میں مختلف النسل انسان اور مختلف جغرافیہ اور بدلتے ہوئے موسم کے حامل علاقے موجود ہیں اسی طرح دنیا میں مختلف قسم کی زبانیں بولی، سمجھی اور لکھی جاتی ہیں۔ ماہرین لسانیات نے معلوم زبانوں کو ان کی باہمی مماثلت، مشابہت، باہمی ربط اور مشترک و ملتے جلتے قواعد کی بنا پر ان کی لسانی تقسیم کرتے ہوئے کبھی ان کو نسبی اور صوریاتی بنادوں پر تقسیم کیا گیا، کبھی یک رکنی، سبقلاحی، اشتقاقی بنیادوں پر۔

کبھی زمانے کی بنا پر، یعنی قدیم، وسطی اور جدید،

کبھی براعظموں کی بنا پر ایشیائی، افریقی، امریکی یوپی وغیرہ،

کبھی تاریخی اعتبار سے،

کبھی قواعد اور صرف ونحو کی بنیاد پر

کبھی ترکیبی (شمولی، امتزاجی، تصریفی) (تصریفی میں ہند یورپی، سامی اور حامی تین خاندان آتے ہیں)

اور کبھی غیر ترکیبی

کبھی صوتیاتی

نحوی بنیادوں پر

فِنک نے زبانوں کو آٹھ گروہوں میں تقسیم کیا:

اسکیمو، ترکی، جارجیائی، عربی، چینی، یونانی، ساموائی، subuja[(۱۷)]

زبانوں کی خاندانی گروہ بندی

خاندانوں کے حوالے سے زبانوں کی تقسیم میں درج ذیل گروہ سامنے آتے ہیں:

امریکی خطہ، اسٹرک خطہ، افریقی خطہ، یوریشیائی خطہ، سامی خاندان، شمالی خطے کی زبانیں، بورال زبانیں، التائی زبانیں، تافی زبانیں تبت چینی خاندان، آسٹروایشیائی خاندان،

دراوڑ خاندان، ہند یورپی خاندان، یونانی، اطالوی، کیلٹک، بالٹک، سلافی خاندان، ہند ایرانی شاخ، ایرانی، دردی، کے علاوہ کچھ زبانیں ایسی بھی ہیں جن کا ابھی تعین ہونا باقی ہے کہ انھیں کس خاندان میں شامل کیا جائے۔

زبانوں کی قدیم تاریخ سے کسی حد تک جو صورت حال سامنے آتی ہے اس معلوم ہوتا ہے کہ سمیریائی ۴۰۰۰ ق م، قدیم مصری ۳۵۰۰ ق م، ہند یورپی تقریباً ۲۰۰۰ تا ۱۸۵۰ ق م، چینی ۲۰۰۰ تا ۱۵۰۰، دراوڑی دوسری صدی عیسوی، جنوبی قافی یا جارجی پانچویں صدی ق م، التائی آٹھویں صدی ق م، تبت برمی نویں صدی، یورالی تیرھویں صدی سے معلوم ہیں۔ ۱۸۲۲ء میں جرمن عالم ہمبولٹ نے دنیا میں زبانوں کے ۱۳ خاندانوں کی بات کی، پارٹی رِج نے ۱۰ کی، فریڈرک مُلر اور دوسرے کئی علما کے مطابق ۱۰۰ خاندان ہیں جب کہ جے. ڈبلیو. پاول نے ۱۸۹۱ء میں امریکہ ہی میں ۵۴ خاندانوں کی نشان دہی کی۔ سپیر نے ۱۹۲۹ء میں چھ بڑے خاندانوں کا ذکر کیا۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں فرنچ اکیڈمی نے دنیا میں زبانوں کی تعداد ۲۷۹۶ بتائی ہے۔ گرے نے درج ذیل ۲۶ خاندان گنوائے ہیں:

ہند یورپی	:	۱۳۲ زبانوں پر مشتمل ہے
حامی سامی	:	۴۶ زبانیں
یورالی	:	۳۲ زبانیں
التائی	:	۳۴ زبانیں
جاپانی، کوریائی	:	۲ زبانیں
اسکیمو	:	۲۴ زبانیں
کاکیشی	:	۲۶ زبانیں
آئبیرو	:	۲ زبانیں
مشرق قریب اور ایشیائی معدوم زبانیں	:	۲۹ زبانیں

ہائپر بوری اور عتیق ایشیائی	:	۱۲ زبانیں
بروشاسکی	:	۱
دراوڑی	:	۲۶ زبانیں
انڈومانی	:	۱۲ زبانیں
چینی تبّتی		۱۱۵ زبانیں
لائی	:	۱
آسٹروایشیاٹک	:	۵۲ زبانیں
ملایاپولینیشیائی	:	۲۶۳ زبانیں
پاپوائی	:	۱۳۲ زبانیں
آسٹریلیائی	:	۹۶ زبانیں
ٹسمانیائی	:	۵ زبانیں
سودان گنی	:	۴۳۵ زبانیں
بانتو	:	۸۳ زبانیں
ہائن ٹاٹ، بش مَین	:	۶ زبانیں
شمالی امریکہ	:	۳۵۱ زبانیں
میکسیکواوروسطی امریکہ	:	۹۶ زبانیں
جنوبی امریکہ	:	۷۸۳ زبانیں[۱۸]

ہندیورپی خاندان

زبانوں کے خاندان میں ہندیورپی خاندان کوایک لسانی اہمیت حاصل ہے۔ پوری دنیامیں بولی جانے والی زبانوں میں سے اکثر اسی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔اس خاندان سے وابستہ زبانوں میں لسانی ادبی، علمی اور سائنسی سرمایہ دوسرے خاندان کی زبانوں کی نسبت زیادہ ہے۔ان زبانوں کے بولنے والوں میں یورپ،ایران، پاکستان،افغانستان،شمالی

بھارت، سری لنکا، نیپال، بھوٹان، امریکہ (شمالی جنوبی)، کنیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جزائر غرب الہند میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کا تعلق مختلف نسلوں، مذہبوں، فرقوں اور سیاسی قومیتوں سے ہے۔[۱۹] اس خاندان سے متعلق زبانوں سے تعلق رکھنے والے سیاسی، معاشی، تہذیبی و ثقافتی اور معاشرتی حوالے سے دنیا میں ایک اہم مقام کے حامل ہیں۔ سر ولیم جونز کی اس دریافت کی وجہ سے کہ سنسکرت اور یورپی کلاسیکی زبانیں ایک ہی لڑی سے تعلق رکھتی ہیں، جرمنوں نے اپنے لسانی مطالعہ کو آگے بڑھایا جس سے تاریخی لسانیات کے تقابلی قاعدے اور صوتی قوانین مرتب ہوئے جرمنوں نے سوچا کہ زبانوں کا یہ خاندان ایک طرف تو یورپ سے جڑا ہوا ہے اور دوسری طرف انگریزی یا آئس لینڈی جرمن زبانوں سے، اسی لیے اس خاندان کا نام ہند جرمن سوچا گیا تا کہ اس نام سے دونوں بڑے علاقوں کی نمائندگی ہو جائے۔ آئرلینڈ کی زبان آئرش کیلٹک خاندان ہونے کی وجہ سے اس نام انڈو کیلٹک بھی رکھا گیا مگر پھر زبانوں کے اس خاندان کا نام ہند یورپی رکھ دیا گیا۔ جرمن علما نے اس بات کو اچھا نہیں سمجھا اور خیال کیا کہ ہند جرمن (Indo German) نام کو بدلنا دراصل جرمن بیزاری کا نتیجہ ہے۔ چونکہ ہند یورپی نام بھی فرانسیسیوں کا دیا ہوا ہے جو کہ جرمنی سے کئی بار جنگ کر چکے تھے اسی لیے جرمن اس خاندان کو ہند جرمن ہی کہتے ہیں اور باقی اسے ہند یورپی کے نام سے پکارتے ہیں۔[۲۰]

ہند یوپی خاندان کو سنسکرتی، یورپی، سرمیئن، سامی (Semitic) اور حامی (Hemetic) کے مقابلے پر جافی (Japhetic)، ہند کلاسیکی، ہند جرمانی (Indo Germanic)، آریائی بھی کہا جاتا رہا۔ بہر حال عالمی سطح پر ہند یورپی رائج ہے۔[۲۱]

ہند یورپی زبانوں کا خاندان اپنی اہمیت کے اعتبار سے لسانیات کے باب میں ایک تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ ہند یورپی کی تین شاخوں کا تعلق قبل مسیح ادوار سے ہے۔ ان شاخوں میں ہند ایرانی، یونانی اور اٹالک (Italic) زبانیں شامل ہیں۔ قدیم ایرانی کی ذیلی شاخ ''ایرانی'' کی قدیم ترین دستاویز ''اوستا'' ہے اور ہند آریائی کی سب سے پرانی زبان ''رگ وید سمہتہ'' ہے۔ ماہرین لسانیات کے مطابق رگ وید کے منتر اور بھجن ۱۶۰۰ تا ۲۰۰۰ قبل

مسیح کے درمیانی عرصے میں وضع کیے گئے۔ڈاکٹر سیتی کمار چٹر جی کی رائے میں ان کی تخلیق ۱۲۰۰ قبل مسیح کے قریب ہوئی ہوگی اس زمانے میں آریا فن تحریر سے ناواقف تھے،اس لیے انھوں نے ان منتروں اور بھجنوں کو از بر کرلیا ہوگا جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہے اور ایک طویل مدت کے بعد ضبط تحریر میں لائے گئے ہوں گے۔(۲۲)

ہند یورپی خاندان کی شاخیں

۱۸۷۰ء میں ایسکولی Askoli نے ہند یورپی کو دو شاخوں میں تقسیم کیا۔قدیم ہند یورپی میں کچھ تالوئی آوازیں تھیں جنھیں {k,kh,g,gh} سے پیش کیا جاتا ہے۔ایک شاخ میں یہ آواز ک میں بدل گئی اور دوسری شاخ میں س ش میں۔اسکولی کے اصولوں کو لے کر فان بریڈلے نے کینٹم Centum اور ستم satam گروہ بنائے کینٹم لیٹن میں اور ستم اوستا میں سو کے عدد کو کہتے ہیں۔ہند یورپی خاندان کی شاخوں کی تقسیم درج ذیل ہے:

کینٹم

اس گروہ میں حتی، طخاری، یونانی، اطالوی (لیٹن)، ایرین، ٹیوٹانک (جرمن)، کیلٹک زبانیں شامل ہیں۔

ستم

اس گروہ میں البانوی، بالٹک، سلافی، آرمینائی اور ہند ایرانی زبانیں شامل ہیں:

گرے نے موجودہ ہند یورپی زبانوں کو بارہ گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔جن میں ہند ایرانی، طخاری، حتی، آرمینی، Thraco-Frigian، یونانی، البانوی، ایرین، اطالوی، کیلٹک، ٹیوٹانک اور بالٹوسلافی شامل ہیں۔

ہند ایرانی

۱۶۰۰ قبل مسیح آریاؤں نے جب یہاں قدم رکھا تو ان میں سے کچھ ایران میں ٹھہر گئے اور کچھ ہندوستان کی طرف چلے آئے ان دونوں کی زبان میں مماثلت اوستا اور سنسکرت کی

زبان کے تقابلی مطالعہ نے ثابت کر دی ہے۔اوستا اور سنسکرت سے زبان کے دو دھاروں نے جنم لیا۔گریرسن نے ہند آریائی کو تین ذیلی شاخوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ایرانی

۲۔دردی یا پشاچی

۳۔ہند آریائی

۱۔ایرانی

ایرانی زبانوں میں فرس قدیم، پہلوی، زبان سغدی، زبان دری، بلوچی اور پشتو زبانوں کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

۲۔دردی یا پشاچی

دردی کنبہ کی بولیاں کشمیر، چترال، کافرستان، پامیر، ہندوکش کے علاقے میں بولی جانے والی بولیاں جن میں کھوار، کافر، شنا، کوہستانی، کشمیری شامل ہیں۔اس کے علاوہ ہنزہ کی وادی میں بولی جانے والی بروشسکی میں بھی پیشاچی کی خصوصیات موجود ہیں۔

۳۔ہند آریائی

ہند آریائی میں سنسکرت، وسط ہند آریائی پراکرتیں، اپ بھرنش (مہاراشٹری اپ بھرنش، شورسینی، پیشاچی، ارد ماگدھی) قواعد نویس مارکنڈیہ کے بقول سنسکرت سے پراکرت نکلی اور پراکرت سے اپ بھرنش۔مذہبی پراکرتوں میں پالی، اردھ ماگدھی، جین مہاراشٹری، جین شورسینی، عمومی سنسکرت (سنسکرت اور پراکرتوں، پالی اور اردھ ماگدھی کی مخلوط زبان)، اوہٹ (شورسینی اپ بھرنش کی ایک صورت جسے پنگل بھی کہا جاتا تھا اور گویے پنگل کے دوہے گاتے تھے۔) پراکرتیں سنسکرت سے جہاں بہت کچھ لیتی تھیں وہاں وہ بہت کچھ دیتی بھی تھیں۔ ہیورنلے اور گریرسن نے جدید ہند آریائی زبانوں کو دو گروہوں اندرونی اور بیرونی میں تقسیم کیا ہے۔
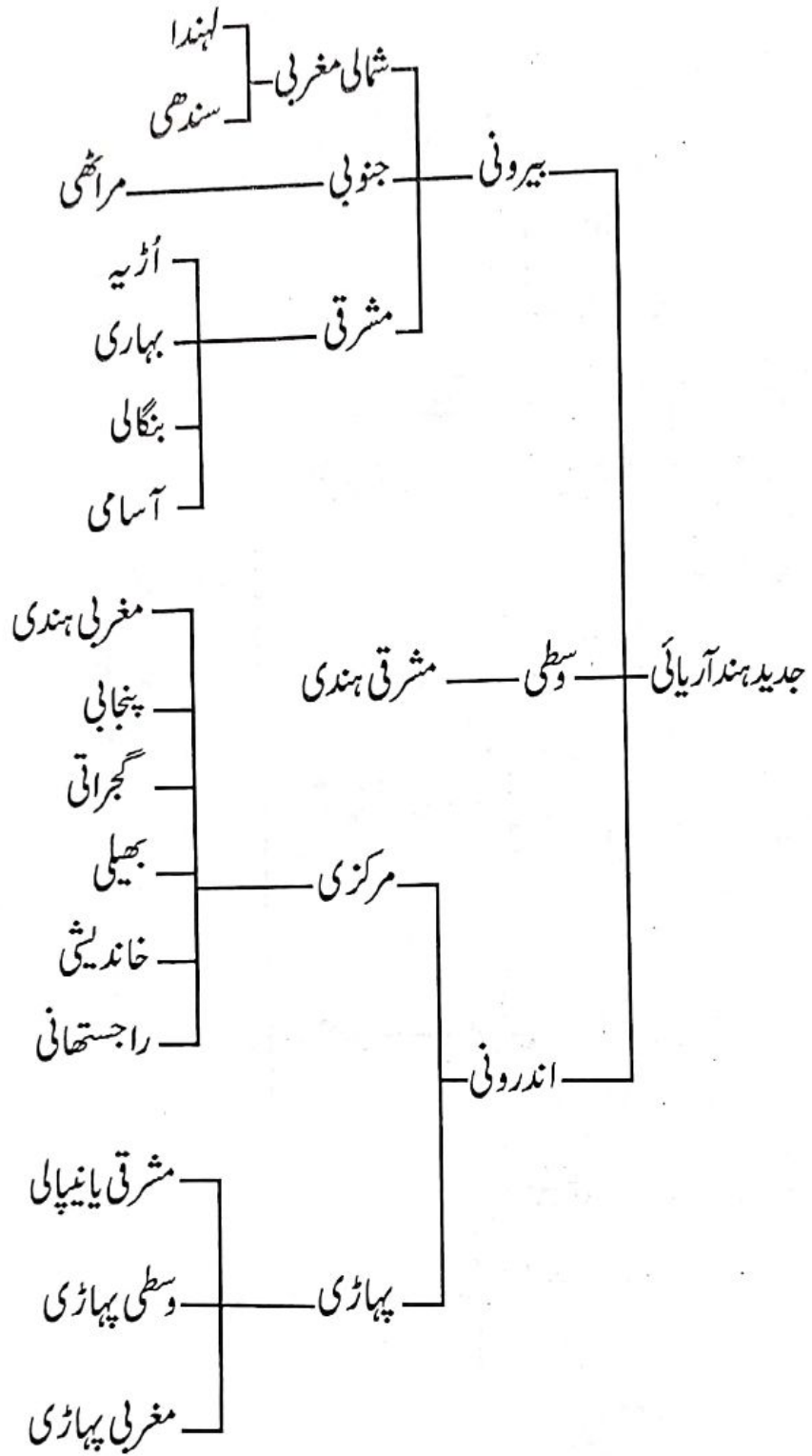
گریرسن نے لسانیاتی جائزہ ہند جلد اول میں ص ۲۰ پر درج بالا گروہ بندی کی ہے۔ (۲۳)

۱۹۳۱ء میں گریرسن نے ایک اور گروہ بندی کی جس کی تفصیل درج ذیل ہے:
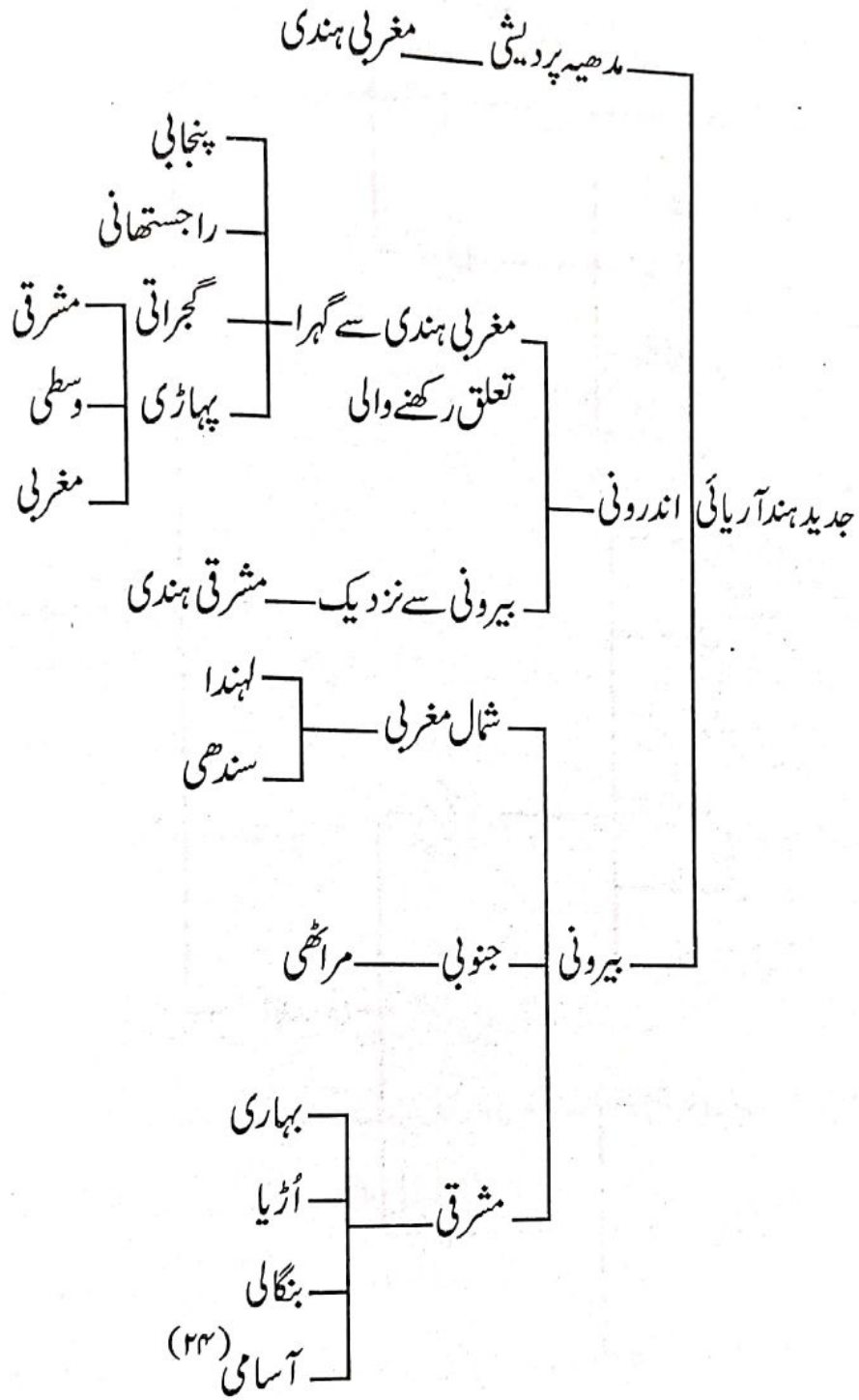
اندرونی گروہ کی زبانوں کو شورسینی ماخذ اور بیرونی گروہ کی زبانوں کو ماگدھی پیداوار کہا ہے۔ بیرونی زبانوں میں لہندا، سندھی، مراٹھی، آسامی، بنگالی، اڑیا، بہاری شامل ہیں جبکہ

اندرونی میں مغربی ہندی، پنجابی، گجراتی، راجستھانی، بھیلی، خاندیشی، مشرقی ہندی، پہاڑی زبانوں کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ہندوستان کی غیر آریائی زبانوں میں دراوڑی، کول، منڈا، تبتی زبانیں وغیرہ شامل ہیں۔[۲۵]

سی ایل باربر نے ہندیورپی زبان کو درج ذیل شاخوں میں تقسیم کیا ہے۔[۲۶]
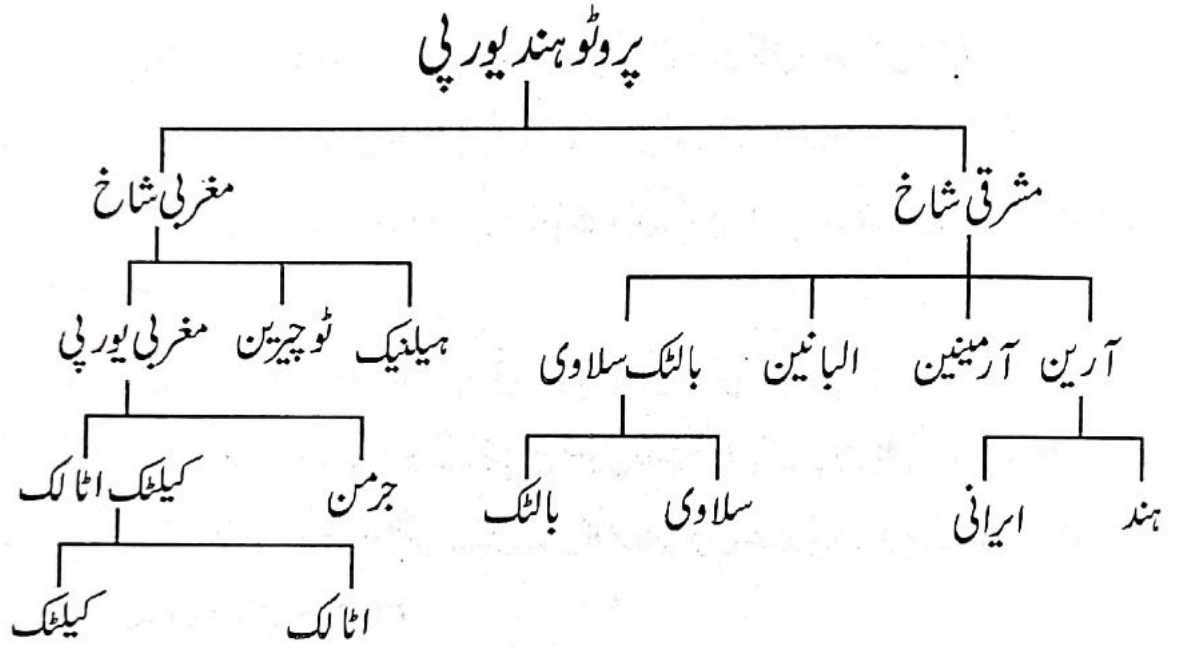
حوالہ جات

۱۔ نورالحسن، مولوی، نوراللغات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۲۳۳

۲۔ عبدالحق، مولوی (مرتب) اردوانگریزی لغت، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۹۲ء، طبع پنجم، ص ۷۰۶

۳۔ شان الحق حقی، فرہنگ تلفظ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۲۰۰۲ء، ص ۵۸۹

۴۔ اردو لغت جلد یازدہم، اردو لغت بورڈ کراچی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۹

۵۔ عبدالمجید، خواجہ بی اے، جامع اللغات جلد سوم، جامع اللغات کمپنی لاہور، ص ۲۴۷

۶۔ سلیم فارانی، ڈاکٹر، اردو زبان اور اس کی تعلیم، پاکستان بک سٹور لاہور ۱۹۶۲ء، بار دوم، ص ۶

۷۔ محی الدین قادری زور، ڈاکٹر، ہندوستانی لسانیات، مکتبہ معین الادب، لاہور، طبع سوم، ۱۹۶۱ء، ص ۱۳، ۳۳،۳۲

۸۔ دتاتریہ کیفی، برج موہن، کیفیہ، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، طبع دوم، ۱۹۵۰ء، ص ۶۰

۹۔ اقتدار حسین خان، ڈاکٹر، لسانیات کے بنیادی اصول، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۸۵ء، ص ۱۵

۱۰۔ الٰہی بخش اختر اعوان، ڈاکٹر: معاشرے میں زبان کا کردار، مخزن ۷، بریڈفورڈ (یوکے)، ۲۰۰۸ء، ص ۶۲

۱۱۔ گیان چند، عام لسانیات، ص ۳۱

۱۲۔ شکیل الرحمٰن، ، زبان اور کلچر، شاہین بکسٹال سرینگر کشمیر ۱۹۵۸ء، ص ۵۱

۱۳۔ شان الحق حقی، لسانی مسائل ولطائف، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۹۶ء، ص ۲۴

۱۴۔ الٰہی بخش اختر اعوان، ڈاکٹر، ہندکو صوتیات، گندھارا ہندکو بورڈ پاکستان پشاور، ۲۰۰۴ء، ص ۱۰

15.Linguistics,cox and wyman Ltd,Reading, Berkshire, London, England,2003 2nd Edition, page.22

۱۶۔ شکیل الرحمٰن، زبان اور کلچر ص ۳۶۔۴۳

۱۷۔ گیان چند جین، عام لسانیات، ص ۳۹۷

۱۸۔ گیان چند جین، عام لسانیات، ص ۴۴۷

۱۹۔ خلیل صدیقی، زبان کیا ہے، ص ۱۷۱

۲۰۔ گیان چند جین، عام لسانیات، ص ۷۹۲، ۷۹۳

۲۱۔ خلیل صدیقی، زبان کیا ہے، ص ۱۷۳

۲۲۔ خلیل صدیقی، زبان کیا ہے، ص ۱۷۳، ۱۷۴

۲۳۔ گیان چند، عام لسانیات، ۸۵۷

۲۴۔ گیان چند، عام لسانیات ص ۸۵۸

۲۵۔ خلیل صدیقی، زبان کیا ہے، ص ۱۹۸ تا ۲۴۸

26 -The Story of Language by C. L. Barber, Cosmo Publications, New Dehli, 2007, page 90

۲۲۔ خلیل صدیقی، زبان کیا ہے، ص ۱۷۳، ۱۷۴

۲۳۔ گیان چند، عام لسانیات، ۸۵۷

۲۴۔ گیان چند، عام لسانیات ص ۸۵۸

۲۵۔ خلیل صدیقی، زبان کیا ہے، ص ۱۹۸ تا ۲۲۸

26 -The Story of Language by C. L. Barber, Cosmo Publications, New Dehli, 2007, page 90

زبان: تعریف وتوضیحات

انسان کی زبان اور تخیل انسان کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتے۔ انسان تنہائی میں بھی کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا ہے۔ اس کا ذہن، سوچ، اور تخیل ہمہ وقت اسے مصروف رکھتے ہیں۔ انسان کی سوچ اور تخیل کے پیچھے زبان کی کارفرمائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کے عضویاتی ڈھانچے یعنی جسم میں تمام اعضاء عمل پذیری کی کیفیت سے مملو نظر آتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ سب کا دائرہ کار الگ الگ ہے۔ سب سے اہم عضو زبان انسان کے عملیاتی اور تخیلاتی اور فکری جوہر کے ترجمان کے طور پر اس کا رابطہ دوسرے انسانوں سے جوڑنے میں اہم کردار کا حامل ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> ''زبان کا انسان کی زبان (عضو) سے کتنا گہرا تعلق ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جس طرح اردو میں زبان (عضو) اور زبان ایک ہی ہیں، اسی طرح انگریزی میں بھی Tongue کا لفظ عضو کے ساتھ ساتھ زبان کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ زبان کی مختلف حرکات ہی مختلف النوع الفاظ ادا کرتی ہیں۔ اس لیے زبان سے ''زبان'' یوں مشروط ہوئی کہ دونوں یک نام ہو گئیں۔ آج اس کا تعین مشکل

ہے کہ عضو کو پہلے زبان کہا گیا یا زبان کی مناسبت سے بعد میں عضو کو زبان قرار دیا گیا، صورت جو بھی رہی ہو، اب عضو اور صوت ایک ہو چکے ہیں۔''(۱)

زبان انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کی ضرورت بن چکی ہے۔ فکری و تہذیبی اور ثقافتی و تمدنی، اخلاقی و روحانی ورثے زبان ہی کے مرہونِ منت ہیں۔ انسانی معاشروں کی تشکیل و ترقی میں زبان کی اہمیت سے انکار ناممکن ہے۔ زبان کی ضرورت و اہمیت کے بارے میں خلیل صدیقی لکھتے ہیں:

''زبان زندگی کے لیے ناگزیر تو نہیں لیکن انسان سے اس کی وابستگی کچھ اتنی زیادہ ہو چکی ہے کہ اس کے بغیر انسان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ فکری جولان گاہوں سے طے کیا جاتا ہے۔''(۲)

لفظ زبان اس قدر ہمہ گیر لفظ ہے کہ اس کی حقیقت اور ماہیت کو ہم کسی مناسب لفظی قالب میں بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ زبان کی اب تک جتنی بھی تعریفیں کی گئی ہیں وہ ادھوری ہیں۔ ہم اپنے محسوسات، نظریات، خیالات، تاثرات اور فکری واردات کی ترسیل کے لیے زبان ہی کو استعمال کرتے ہیں۔ زبان باقاعدہ ایک سوچے سمجھے اور مانے ہوئے مروجہ نظام کے تحت قوت گویائی کے ذریعے انسانی خیالات و احساسات کے اظہار و ابلاغ کے مؤثر وسیلے کا نام ہے۔

''زبان کی واضح تعریف ان الفاظ میں کی جا سکتی ہے کہ زبان انسانی خیالات اور احساسات کی پیدا کی ہوئی ان تمام عضوی اور جسمانی حرکتوں اور اشاروں کا نام ہے جن میں زیادہ تر قوت گویائی شامل ہے اور جن کو ایک دوسرا انسان سمجھ سکتا ہے اور جس وقت چاہے اپنے ارادہ سے دہرا سکتا ہے۔''(۳)

اصطلاحی لحاظ سے زبان وہ ذریعہ ہے جس کی مدد سے ذات اور اپنے ماحول کے تقاضے کے مطابق اظہار و اخذ کا عمل خاموشی سے علامات کی صورت میں لکھ کر کیا جائے یا آواز سے کلمات کی صورت میں بول کر کیا جائے۔۔۔ یہ اظہار و اخذ اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتا جب تک لکھنے یا بولنے کی علامات اور الفاظ بامعنی نہ ہوں۔ گویا زبان وہ بامعنی آوازیں یا

علامتیں ہیں جن کی وساطت سے انسان بصورت تقریر یا بصورت تحریر اپنے خیالات کا اظہار کرتا اور دوسروں سے بذریعہ سماع یا مطالعہ معلومات اخذ کرتا ہے اسی لیے زبان کو تبادلۂ خیالات اور اظہار خودی کا آلہ کہا جاتا ہے۔اس لحاظ سے تمام حروف اور تمام الفاظ کے مجموعے (مرکبات) جو تحریر یا تقریر میں استعمال ہوتے ہیں، زبان کے دائرے میں داخل ہیں اور زبان کے عناصر سمجھے جاتے ہیں۔(۴)

اگر زبان نہ ہوتی تو ہم ایک دوسرے تک اپنا مدعا پہنچانے میں ناکام رہتے، نہ زبان ہوتی، نہ علوم وفنون ہوتے، نہ ہی تہذیب وثقافت ارتقائی سفر طے کرتے ہوئے اس دورِ جدید میں داخل ہو پاتے۔

> ''زبان کا اصل کام کیا ہے۔۔۔زبان انسان کے خیالات کی ترسیل کا سب سے زیادہ مستعمل اور ترقی یافتہ ذریعہ ہے،اس بیان کے مضمرات بہت دلچسپ ہیں۔ترسیل کا مطلب ہے کہ کسی قسم کی معلومات کو دوسروں تک پہنچانا یا کسی مقصد کے تحت مرسل الیہ (Receiver) کو پیغام دینا۔زبان میں مبدا ابلاغ (Source) اور مرسل الیہ دونوں انسان ہوتے ہیں اور جو پیغام دیا جاتا ہے وہ یا تو ہوا کی لہروں کے ذریعے بول کر یا کاغذ وغیرہ پر تحریر کے ذریعے دوسروں تک پہنچایا جاتا ہے۔''(۵)

ذہن میں اٹھنے والے سوالات کو زبان جن الفاظ وتراکیب اور جملوں کی وساطت سے بیان کرتی ہے ان کی بھی اپنی جگہ کم اہمیت نہیں ہے۔لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان کے پاس جس قدر سرمایۂ الفاظ ہوگا اسی قدر وہ اپنی بات کو دوسروں تک خوبصورت اور جامع انداز میں پہنچانے کے قابل ہوگا یعنی زبان کی فصاحت وبلاغت اور خیالات کی ترسیل کے نظام میں الفاظ وتراکیب کے مروجہ ڈھانچے کا کردار مرکزی نوعیت کا ہے۔

> ''لفظ کے لغوی معنی کسی چیز کے پھینک دینے یا منہ سے نکال ڈالنے کے ہیں۔اصطلاحی معنوں میں لفظ بمعنی ملفوظ ہے۔''(۶)

یہ الفاظ وتراکیب وہ علامتیں ہیں جن کو ہم نے اپنی زبان اور اردگرد کے ماحول کے

حوالے سے وضع کیا ہے۔ یہ علامتیں انسان کے حلق سے خارج ہونے والی مختلف آوازوں سے ہم آہنگ ہوکر زبان کی ساخت کی ترتیب وتشکیل کا باعث بنتی ہیں۔ ان آوازوں کو ہم قوتِ گویائی سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں جسے قدرت نے ہمارے جسم کو ودیعت کیا ہوا ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں:

> ''زبان ایک تقلیدی عمل کا نام ہے جو اپنے گردوپیش کے دوسرے انسانوں کو دیکھ کر بے اختیار کیا جاتا ہے۔ جس وقت انسان پہلی بار آنکھ کھولتا ہے اس کے صوتی عضلات ومخارج اس قدر مکمل ہوتے ہیں کہ وہ دوسروں کی آوازوں کی بے اختیار نقل کرنا شروع کردیتا ہے اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ اسی زبان میں سوچنے اور خواب دیکھنے لگتا ہے۔''(۷)

دراصل زبان کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک اس کا تفاعلی (Fuctional) پہلو ہے یعنی زبان کا ہمارے سماج میں استعمال اور دوسرے رسمی (Formal) جس میں زبان کی ساخت کی بناوٹ کا طریقہ آجاتا ہے۔(۸)

اس میں شک نہیں عہد قدیم کا انسان جب کوہ وبیاباں میں زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا، بہت وحشی وناتراشیدہ تھا تاہم درندوں اور جانوروں سے ضرور مختلف تھا، یعنی جانوروں میں ایک قدر (Instinct) کے علاوہ اور کوئی قوت غوروفکر کی نہ پائی جاتی تھی اور انسان سمجھ بوجھ کی صلاحیت لے کر آیا تھا، وہ سوچ سکتا تھا، سوچنے کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرتا تھا اور دوسروں تک اپنے دل کی بات پہنچانے کی خواہش اس کے اندر پائی جاتی تھی، اس کے اندر مختلف جذبات پیدا ہوتے تھے اور وہ ان جذبات کے اظہار کی بھی کوشش کرتا تھا۔ جب وہ نیم مہذب حالت تک پہنچا تو اس نے اس کے لیے تین طریقے اختیار کیے، ایک یہ کہ وہ دوسروں کے پاس کچھ چیزیں بھیج دیتا تھا یا انھیں راستہ میں رکھ دیتا تھا اور مقررہ اصول کی بنا پر وہ سمجھ لیتے تھے کہ بھیجنے والے کا کیا مقصد ہے، دوسرا طریقہ یہ تھا کہ وہ سُتلی یا کپڑے میں گرہ لگا کر کسی خاص بات کی یاد تازہ رکھتے تھے یا دوسروں تک اسے پہنچادیتے تھے۔ تیسرا طریقہ یہ تھا

کہ لکڑی وغیرہ پر خاص خاص نشانات بنا کر لوگوں کو بھیج دیتے تھے اور انھیں ذرائع سے وہ پیغام رسانی کا کام لیتے تھے۔[9]

زبان اپنی ساخت اور ماہیت کے اعتبار سے مختلف علامات اور تشبیہات پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ زبان کے ارتقا اور نشو ونما میں تصویریں بھی اہم کردار کی حامل رہی ہیں۔ الفاظ وحروف کی ایجاد سے پہلے انسان علامات واشارات اور تصاویر کی مدد سے اپنا مدعا دوسروں پر ظاہر کرنے کا کام لیتا تھا۔ مہدی حسن لکھتے ہیں:

''جب زبان بہت زیادہ ترقی یافتہ نہیں تھی اور انسان نے مختلف چیزوں کے نام مقرر نہیں کیے تھے تو بجائے الفاظ کے ان چیزوں کی شکلیں بنا کر اپنا مطلب واضح کیا جاتا تھا چنانچہ مختلف قدیم آثاروں سے جو تحریریں برآمد ہوتی رہی ہیں ان میں تصویروں کی زبان موجود ہے۔''[10]

زبان ایک ایسی نعمت ہے جو صرف انسان ہی کو ودیعت کی گئی ہے، چاہے انسان پڑھا لکھا ہو یا ان پڑھ روزمرہ زندگی اور معاملات میں زبان کا استعمال کرتا ہے۔ زبان انسانوں کی آپس میں تعلق داری اور رشتہ استواری میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ بقول گیان چند جین:

''زبان بالقصد، من مانی، قابل تجزیہ، صوتی علامات کا وہ نظام ہے جس کے ذریعے ایک انسانی گروہ کے افراد اپنے خیالات وجذبات کی ترسیل باہمی کرتے ہیں۔''[11]

زبان ایک مسلسل عمل ہے جسے انسان اپنی پیدائش سے سیکھنا شروع کرتا ہے اور آخر تک سیکھتا چلا جاتا ہے۔ معاشرے میں ہر فرد دوسرے فرد سے زبان کے الفاظ وحروف کا تبادلہ کرتا ہے جس کے نتیجے میں زبان پنپتی اور ترقی کرتی چلی جاتی ہے۔ اس بارے میں خلیل صدیقی لکھتے ہیں:

''زبان ایک سماجی ورثہ ہے اور سماج ہی کے نطقی اعمال سے یہ ورثہ نہ صرف محفوظ رہتا ہے بلکہ اس میں قطع برید بھی ہوتی رہتی ہے اور اضافہ

بھی۔ یہ سب کچھ افراد کی وساطت سے ہوتا ہے زبان کا ہر تغیر خواہ اس کی نوعیت کچھ بھی ہو اس کا ہر لفظ کسی نہ کسی فرد ہی کی بدولت رونما ہوا ہے۔''(۱۲)

زبانیں کسی سوچے سمجھے منصوبے اور دانستہ کوشش کے طور پر معرض وجود میں نہیں آتیں بلکہ یہ خود بخود انسانی اور سماجی و معاشرتی اشتراک کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ پھر بعد میں اس کی تراش خراش اور اس کی قواعد مرتب کرنا ایک الگ عمل ہے جس میں کبھی کبھی صدیاں بھی لگ جاتی ہیں۔ محی الدین قادری زور لکھتے ہیں:

''زبانوں کی تشکیل اور ارتقا براہِ راست انسانی خیالات کی تشکیل اور ارتقا پر منحصر ہے۔ اور زبان کی تفہیم ملفوظہ آوازوں کے علاوہ انسانی خیالات اور احساسات پر بھی مبنی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فہم انسانی اور نطقِ انسانی کے نفسیاتی قوانین بھی ایک دوسرے سے بالکل متعلق ہوتے ہیں۔''(۱۳)

الفاظ حروف کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ یہ حروف ایک اکائی کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں اور جب یہ اکائیاں اجتماعی طور پر اشتراکی عمل سے گزرتی ہیں تو یہی بے معنی حروف مختلف زاویوں سے وقوع پذیر ہو کر ایک جہان معانی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ الفاظ و معانی آپس میں ایک گہرے ربط سے جڑے ہوتے ہیں اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ الفاظ وہی رہتے ہیں لیکن معانی اپنی حیثیت بدل لیتے ہیں۔ معانی کی یہ تبدیلی وقت، حالات اور الفاظ کو برتنے کے رویوں کی وجہ سے رو بہ عمل ہوتی ہے۔ قمر جمیل لکھتے ہیں:

''سوسیئر کہتا ہے کہ زبان لفظوں کے ایسے مجموعے کا نام ہے جس کا بنیادی مقصد اشیاء کو نام دینا ہے۔ زبان میں لفظ معنی رکھتے ہیں اس لیے کہ لفظ رشتوں کے جامع نظام کا حصہ ہیں۔ زبان کا نظام اپنے تفریقی رشتوں کی وجہ سے کارگر ہوتا ہے۔ جو باہم مربوط بھی ہوتے ہیں اور مختلف بھی۔''(۱۴)

زبان کو شروع دن ہی سے ہر شعبہ حیات میں ایک اہم اور کلیدی کردار حاصل رہا

ہے۔ زبان جب کسی ایک مخصوص یا باقاعدہ شکل میں موجود نہیں تھی اس وقت بھی ہم اس کے کردار سے چشم پوشی نہیں برت سکتے کیونکہ مہمل اور بے ربط آوازوں سے بھی انسان کسی حد تک اپنا مدعا دوسرے شخص پر ظاہر کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ یہی مہمل اور بے ربط الفاظ رفتہ رفتہ مختلف علامات اور نشانات کی شکل میں ایک باقاعدہ زبان کی صورت اختیار کرتے چلے گئے۔ اس بات کو کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ علمی و تعلیمی، سائنس و ٹیکنالوجی، سیاسی و سماجی، معاشرتی و اقتصادی ترقی، جوہری اور کمپیوٹر وغیرہ جیسے شعبہ جات میں ترقی دراصل زبان کی ترقی سے مشروط ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم اس کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ جو معاشرہ ترقی کی جانب گامزن ہوتا ہے وہ سب سے پہلے اپنی زبان کی تراش خراش کر کے اسے ترقی دیتا ہے اور پھر اس زبان کو استعمال میں لاتے ہوئے ترقی کے مختلف مدارج طے کرتا چلا جاتا ہے۔ اختر حسین رائے پوری لکھتے ہیں:

''انسان کی سب سے بڑی ایجاد زبان ہے اور ادب اس کے تخلیقی اظہار سے عبارت ہے، خواہ وہ نظم میں ہو یا نثر میں۔۔۔ زبان کی ترقی معاشرے کی ترقی سے وابستہ ہے۔''(۱۵)

سائنس و ٹیکنالوجی ہی کے لیے نہیں بلکہ شعر و ادب کے لیے بھی زبان کی اہمیت سے انکار ناممکن ہے۔ زبان اور زبانوں کا ذخیرۂ الفاظ شعر و ادب میں نئے نئے خیالات اور نظریات کے در وا کرتا ہے۔ بقول مرزا خلیل احمد بیگ:

''زبان کی لسانیاتی سطح سے قطع نظر، اس کی ایک سطح وہ ہوتی ہے جو اس کی ادبی سطح کہلاتی ہے۔ ادبی سطح پر بھی زبان کی جڑیں سماج اور تہذیب کی ہر کروٹ زبان کے وسیلے سے ادب میں منعکس ہوتی ہے۔ گویا زبان و ادب سماج اور تہذیب کا آئینہ دار ہوتا ہے۔''(۱۶)

تعلیم و تمدن، تہذیب و ثقافت، سیاست و معاشرت کی موجودہ ترقی یافتہ شکل زبان کی ترقی ہی سے ممکن ہوئی ہے۔ زبان اگر وسیلہ اظہار بیان نہ ہوتی تو شاید معاشرہ موجودہ شکل کی بجائے کسی اور سمت میں اپنے آپ کو ترتیب دیتا۔ یعنی زندگی کے کسی بھی میدان میں ترقی

پذیری کا انحصار فصیح و بلیغ الفاظ و تراکیب کی صورت ہی میں ممکن ہے۔ زبان ولسانیات کو اپنی ضروریات کے مطابق ڈھال کر ترفع تک پہنچانا انسان کی کامیابی اور ترقی کا پہلا زینہ ہے۔ جس سے اس نے مزید شعبہ ہائے زندگی میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں۔ علی حیدر ملک لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر فوق کے خیال میں زبان کی ایجاد انسان کا پہلا اور سب سے بڑا کارنامہ ہے دوسرا بڑا کارنامہ وہ تحریر کی ایجاد کو قرار دیتے ہیں۔''(۱۷)

انسان نے اشاروں اور علامتوں کی مدد سے اپنا مدعا ایک دوسرے پر ظاہر کرنا شروع کیا اور پھر ان علامتوں اور اشاروں کو الفاظ و حروف کا جامہ پہنا کر اسے اپنے ملکی، قومی اور جغرافیائی حالات و ماحول کے مطابق ایک مخصوص زبان کے سانچے میں ڈھالا اور اپنے معاشرتی اور تہذیبی و ثقافتی ضروریات اور سماجی معاملات کی تشکیل و تکمیل کے لیے اسے وقت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ تراش خراش کر اظہار مدعا کے لیے ایک مؤثر وسیلہ کے طور پر استعمال شروع کیا۔ بلاشبہ یہ انسان کا مہذب معاشرے کی تشکیل کی جانب اہم اور اولین قدم تھا۔ جس کے بعد وہ بتدریج ترقی کرتا ہوا موجودہ ایٹم، کمپیوٹر، سائنس اور ٹیکنالوجی کے جدید دور تک آ گیا ہے۔ قوموں کی تاریخ کے ساتھ ساتھ ہی زبان کی تاریخ بھی رقم ہوتی جاتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> ''اقوام اور تہذیب و تمدن کی مانند زبان کی بھی اپنی مخصوص تاریخ ہوتی ہے۔ ایسی تاریخ جو بظاہر تو اقوام اور تہذیب و تمدن سے مربوط نظر آتی ہے۔ (بلکہ بعض صورتوں میں ان ہی سے نام بھی پاتی ہے) لیکن درحقیقت وہی تہذیب و تمدن کے انداز بھی متعین کرتی ہے۔''(۱۸)

زبان ایک ان پڑھ اور غیر مہذب آدمی کے لیے بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنا کہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان کو اس کی ضرورت ہے۔ کیونکہ سیکھنے اور مشاہدہ و تجربہ کو بیان کرنے کے لیے زبان ایک اہم وسیلے کی حیثیت رکھتی ہے۔ زبان جتنی ترقی یافتہ اور فصیح و بلیغ ہوگی

مطلوبہ مقاصد اور اہداف بھی اتنی ہی آسانی اور بہتری کے ساتھ حاصل کیے جاسکیں گے۔

محمد ساجد خاکوانی لکھتے ہیں:

''انسانی معاشرے میں ادب کی اہمیت نونہال کے لیے پانی کی مانند ہے۔ قبیلہ بنی نوع انسان کے بہترین اذہان ادب تخلیق کرتے ہیں اور ادب کی ترویج واشاعت کی واحد بیساکھی زبان ہی ہے، حتیٰ کہ بہترین ادب کی تخلیق کے لیے بعض اوقات تعلیم کی شرط بھی غیر مؤثر ہو جاتی ہے۔ اس آسمان نے کتنے ہی ایسے لوگ دیکھے جو مکتب و مدرسہ کے راستہ سے نابلد مگر انسانیت کے لیے راستہ نما بن کر ابھرے۔ لیکن زبان کی غیر موجودگی میں ادب کی تخلیق قطعاً ناممکن ہے۔ حتیٰ کہ ایک عام انسان کی قابلیت بھی اس کی زبان دانی میں پوشیدہ ہے۔''(۱۹)

زبان خلا میں پیدا نہیں ہوتی۔ زبان (عضو) کی کوکھ سے زبان جنم لیتی ہے۔ زبان کا جنم لینا کیا ہے؟ حالات وظروف کے مطابق بدل بدلا کر اس کا نیا روپ اختیار کرنا۔ زبان برابر ادلتی بدلتی اور حالات کے مطابق نت نئے روپ دھارتی رہتی ہے جب تک زبان کا بولنے والوں سے تعلق ہے یعنی زبان زبانوں پر ہے، شکست وریخت اور توٹ پھوٹ کا سلسلہ اس میں برابر جاری رہے گا۔ زبانوں کی خراد پر زبان ترشتی ترشاتی، چھلتی چھلاتی اور کٹ کٹا کر سڈول بنتی رہے گی۔ زبان کا بولنے والوں سے تعلق منقطع ہوا نہیں کہ جمود آیا اور ٹھٹھری۔ ردّوبدل زبان کی زندگی ہے اور یہی اس کا ارتقا ہے۔ اس لیے زبان کا ارتقا اس کی زندگی ہے۔(۲۰) زبان کی ناگزیر اہمیت کی وجہ سے ہر ملک وقوم نے اپنی زبان کی نگہداشت، پرداخت اور اس کی ترقی کے لیے مختلف شعبے قائم کیے ہیں۔ زبانیں نہ صرف اداروں بلکہ افراد کی انفرادی کوشش وریاضت کی وجہ سے پنپتی اور پھلتی پھولتی ہیں۔ زبان ایک ایسا شعبہ ہے جس میں ہر وقت کچھ نہ کچھ کام ہو رہا ہوتا ہے:

''زبان انسانوں میں آپس میں رابطہ قائم کرنے کا سب سے اہم ذریعہ ہے ہم صبح سے شام تک بے شمار الفاظ بولتے ہیں، سنتے ہیں اور پڑھتے

ہیں۔کسی سے بات چیت کرر ہے ہوں ریڈیو سن رہے ہوں اخبار یا کتاب
پڑھ رہے ہوں یا ٹیلی فون پر محو گفتگو ہوں،زبان کے بغیر گزارا نہیں زبان
ایک دوسرے سے رابطہ قائم کرنے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔''(۲۱)

زبان ایک معاشرتی فعلیت کا نام ہے اور انسان ایک معاشرت پسند اور مل جل کر رہنے والا جاندار ہے۔ جو ایک دوسرے کے دکھ سکھ کو محسوس بھی کرتا ہے اور دکھ سکھ میں کام بھی آتا ہے۔یہی معاشرت پسندی اسے ایک ایسی زبان سیکھنے اور اپنانے پر مجبور کرتی ہے تاکہ وہ لفظوں کی صورت میں اپنا مدعا دوسرے انسان کے سامنے بیان کر سکے اور دوسرے کی بات سن اور سمجھ سکے۔زبان انسان کی بنیادی ضروریات میں سے ہے۔ جسے اگر انسان سے جدا کر دیا جائے تو وہ صدیوں بلکہ ہزاروں کروڑوں سال پیچھے چلا جائے گا۔زبان اور علمِ زبان کی اہمیت پہلے بھی کسی طور کم نہ تھی مگر آج یہ انسانی زندگی اور ترقی میں کلیدی کردار کی حامل ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۰۲ء، بار دوم، ص ۱۵
۲۔ خلیل صدیقی، زبان کیا ہے، بیکن بکس، ملتان، ۱۹۸۹ء، ص ۹، ۱۰
۳۔ محی الدین قادری زور، ہندوستانی لسانیات، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۵ء، ص ۲۶
۴۔ سلیم فارانی، ڈاکٹر، اردو زبان اور اس کی تعلیم، لاہور، پاکستان بک سٹور، بار دوم، ۱۹۶۲ء، ص ۶
۵۔ نصیر احمد خان، داکٹر (مترجم) ڈیوڈ کرسٹل، لسانیات کیا ہے، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ص ۶۴
۶۔ فتح محمد خان، مولوی: حواشی، دیباچہ مشمولہ مصباح القواعد، پی، سی، دوادش شرینی علی گڑھ، ہیرا لال پرنٹنگ پریس علی گڑھ، ۱۹۳۸ء، ص ۸
۷۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو کی زبان، دیباچہ، فضلی سنز لمیٹڈ لاہور ۱۹۹۲ء ص ۱۱
۸۔ نصیر احمد خان، ڈاکٹر (مترجم) ڈیوڈ کرسٹل، لسانیات کیا ہے، ص ۶۳
۹۔ فنِ تحریر کی ایجاد سے پہلے، نگار جولائی ۱۹۵۳ء، ص ۱۴
۱۰۔ مہدی حسن، ابلاغ عام مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۶۸ء ص ۴۸
۱۱۔ گیان چند جین، عام لسانیات، ترقی اردو بیورو نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص ۴۵
۱۲۔ خلیل صدیقی، زبان کا ارتقا، زمرد پبلی کیشنز کوئٹہ، ۲۰۰۰ء ص ۱۳
۱۳۔ محی الدین قادری زور، ہندوستانی لسانیات ص ۲۸
۱۴۔ قمر جمیل، جدید ادب کی سرحدیں، جلد اول مکتبہ دریافت کراچی ۲۰۰۰ء ص ۲۷۰
۱۵۔ اختر حسین رائے پوری، اقتباس ماخوذ از گرد راہ بحوالہ افکار جنوری ۱۹۸۶ء ص ۱۳
۱۶۔ خلیل احمد بیگ، مرزا، اردو زبان کی تاریخ، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس ۲۰۰۷ء، ص ۴۰۹
۱۷۔ علی حیدر ملک، ڈاکٹر حنیف فوق کی تنقید نگاری مشمولہ سہ ماہی ادبیات اسلام آباد شمارہ ۵۷، ۲۰۰۲ء ص 115
۱۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو زبان کیا ہے، ص ۱۲۲
۱۹۔ محمد ساجد خاکوانی، اردو زبان۔ پس منظر و پیش منظر، ماہنامہ قومی زبان کراچی، جون ۲۰۰۰ء، ص ۵۸
۲۰۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، اردو لسانیات، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۳ء، ص ۱۵
۲۱۔ مہدی حسن، ابلاغ عام، ۱۹۶۸ء ص ۲۰

اردو کیا ہے؟

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے تاریخ کا ایک نیا رخ اور باب سامنے آتا ہے۔ تہذیب وتمدن، رہن سہن اور زبان و بیان میں مختلف تبدیلیاں رونما ہوئیں۔اسلام نے برصغیر کے لوگوں کے اندازِ فکر اور طرزِ زندگی پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے،انسانی معاشرے میں زبان کو مرکزی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔زبان انسانی رویوں کی پرداخت میں اہم اور کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔معاشرے کی تبدیلی زبان وادب کی تبدیلی سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور مسلمان حکمرانوں کی انسان دوستی نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں میل جول،اخوت ورواداری اور تعلق استواری کی جو فضا قائم کی اس نے برصغیر کی زبان کو نیا ملبوس عطا کیا۔مسلمانوں کی زبان اور ہندوستان کی مختلف بولیوں میں جب ایک اٹوٹ رشتہ قائم ہوا تو ایک مشترک زبان وجود میں آئی اس نئی زبان کو باقاعدہ زبان بننے کے لیے سینکڑوں برس کی مسافت طے کرنا پڑی اور اہلِ ہند کے ساتھ مختلف علاقوں میں ہجرت کرنا پڑی۔

یہ زبان مختلف علاقوں اور مختلف ادوار میں مختلف ناموں سے منسوب ہوتی رہی۔ شروع میں اس کو ہندی یا ہندوی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔صوفیائے کرام کے ملفوظات میں

بھی اسے ہندی یا ہندوی لکھا جاتا رہا۔[1] تزکِ بابری میں ایک راجا کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ کشمیری اور ہندوی دونوں زبانیں جانتا ہے۔[2] امیر خسرو نے دیباچہ غرۃ الکمال میں مسعود سعد سلمان کے (۱۰۴۶ء) عربی اور فارسی شاعری کے دیوان کے ساتھ اس کے ہندوی شاعری کے دیوان کا بھی ذکر کیا ہے۔[3] محمد عوفی نے ''لباب الالباب'' میں مسعود سعد سلمان کے بارے میں لکھا ہے کہ

''اوراسہ عدیوان است۔ یکے بتازی ویکے بپارسی ویکے ہندوی''[4]

اس زبان کو مختلف علاقوں میں مختلف علاقائی ناموں سے بھی موسوم کیا جاتا رہا ہے۔ یہ زبان دکن میں دکنی، گجرات میں گجراتی، ملتان میں ملتانی، دہلی میں دہلوی اور لاہور میں لاہوری کہلاتی رہی ہے۔

ہندی یا ہندوی کے بعد اردو کے لیے ریختہ کا لفظ مروج ہوا۔ ریختہ فارسی زبان کا لفظ ہے جو ریختن مصدر سے ہے۔ جس کے معنی ہیں بنانا، ایجاد کرنا، نئے سانچے میں ڈھالنا۔ اس کے معنی گرے پڑے اور پکی تعمیر کے بھی ہیں۔ اردو مختلف بولیوں کا مرکب بھی تھی، گری پڑی بھی تھی، اور ایک نئی ایجاد بھی تھی اسی مناسبت سے اسے ریختہ کہا گیا۔ ریختہ کا لفظ سب سے پہلے امیر خسرو نے استعمال کیا۔ ریختہ زیادہ تر ایسی شاعری کے لیے استعمال ہوا جس میں عموماً دو زبانوں (فارسی، ہندوی) کو متحد کیا جاتا تھا۔ شاہ عبدالقادر نے ترجمہ قرآن میں ریختہ کو نثر کی زبان کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ مصحفی کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ اس نے ریختہ کے فروغ کے زمانے میں اس زبان کے لیے ''اردو'' کا لفظ رائج کیا۔[5]

البتہ مصحفی کو ہے ریختہ میں دعویٰ
یعنی کہ ہے زباں داں اردو کی وہ زباں کا

ولی، سراج اورنگ آبادی، میر تقی میر، قائم چاند پوری، مصحفی اور غالب نے بھی اردو زبان کے لیے ریختہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔

ملا وجہی نے سب رس میں اسے زبانِ ہندوستانی لکھا ہے۔ گارساں دتاسی اور

گلکرسٹ نے بھی اسے ہندوستانی کا نام دیا ہے۔اوراس سے شمالی مغربی صوبوں اور پنجاب کی زبان مراد لی ہے۔[6] اردو زبان کے لیے لفظ ہندوستانی کی سب سے قدیم شہادت ابراہیم عادل شاہ کے دور میں فرشتہ کے ہاں ملتی ہے۔[7] ابوالفضل نے بھی آئین اکبری میں اردو کے لیے ہندوستانی کا لفظ استعمال کیا ہے۔سترھویں صدی عیسوی میں انگریز اکثر اردو کے لیے ہندوستانی کا لفظ استعمال کرتے تھے۔

بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری ہم اردو (اڑدو) اپنی روزانہ کی بول چال میں ''ڈھیر'' یا بہت سی چیزوں کے جمع ہونے کے معنی میں استعمال کرتے ہیں اور یہ لفظ اس مفہوم میں سندھ میں عربوں کی آمد سے تین ہزار سال پہلے سے رائج ہے۔قدیم ناردی (Nardie) دیو مالا میں ہمیں لفظ (Urdu) اردو یا ارتھ (Urth) ایک دیوی کے نام کی صورت میں ملتا ہے جو تقدیر کی قائم مقام سمجھی جاتی ہے۔[8]

لفظ اردو ترکی زبان سے تعلق رکھتا ہے۔جس سے مراد خیمہ، بازار، لشکر، محل، حرم گاہ اور قلعہ ہیں۔ترکی زبان کی لغت میں یہ لفظ (Ordu)[9] اوردو ہے۔ترکی لغت میں ایک اور جگہ ''یوردو'' (Yordu) بھی ملتا ہے۔جس کے معنی آبائی ملک اور گھر ہیں۔[10] وزیر رشید الدین فضل اللہ جامع تواریخ کے حوالے سے لفظ اردو کو چنگیز خان اور اس کی اولاد کے زمانے میں تلاش کرتا ہے۔قراقرم کا قدیم نام اردو بلیغ اور کاشغر کا اردو قند تھا۔سولہویں صدی عیسوی میں ایک ترکی قبیلے کا نام بھی اردو ملتا ہے۔[11] علامہ آئی آئی قاضی اردو کو ترکی زبان کا لفظ ماننے سے انکاری ہیں۔ان کے خیال میں اردو آریائی زبان کے قدیم لفظوں میں سے ہے۔

ہندوستان میں اردو کا لفظ سب سے پہلے تزکِ بابری میں ملتا ہے۔اکبر کے عہد میں یہ لفظ زیادہ استعمال ہونا شروع ہوا۔شیرانی نے اکبر کے زمانہ کے حوالے سے جو تراکیب گنوائی ہیں وہ اردوئے عیسا، اردوئے معلی، اردوئے لشکر، اردوئے حضرت، اردوئے ظفر قرین، اردوئے عالی اور اردوئے بزرگ ہیں۔ان کا مقصد شاہی فرودگاہ اور شاہی لشکر ہے۔[12]

شاہ جہان نے سب سے پہلے اردو زبان کے لیے اردوئے معلیٰ کا نام پسند کیا۔

اردوئے معلیٰ ٹیکسالی زبان تھی اور اس کے مقابلے میں دوسری علاقائی زبانوں کو معیاری نہیں سمجھا جاتا تھا۔(۱۳) ۱۷۸۸ء میں پیر مراد شاہ نے اپنے ایک منظوم خط میں اردو استعمال کیا۔ مصحفی اور گلکرسٹ نے ۱۷۹۶ء میں اردو کا لفظ زبان کے لیے استعمال کیا۔ اس کے بعد یہ اتنا عام ہوا کہ ریختہ اور ہندی کے الفاظ اردو زبان کے لیے استعمال ہونا بند ہو گئے۔

۱۹۴۷ء آزادی کے بعد کچھ لوگوں نے اس زبان کا نام پاکستانی رکھنے کی تجویز پیش کی تو پورے ملک میں اس کے خلاف ردِ عمل کا اظہار کیا گیا۔ اگر اردو کی جگہ اس زبان کا نام پاکستانی رکھ دیا جائے تو بہت سی علاقائی زبانیں جو ہمارے بزرگوں کا قیمتی ورثہ ہیں اور اردو کے لیے معاون دریاؤں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کا وجود ختم ہو جائے گا اور ایک بڑا لسانی نقصان ہوگا۔(۱۴) اردو صرف پاکستان تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ یہ زبان دنیا کے بیشتر علاقوں میں اسی نام سے جانی پہچانی جاتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ میمن عبدالمجید سندھی، ڈاکٹر، لسانیات پاکستان، مقتدرہ قومی زبان پاکستان اسلام آباد، ۱۹۹۲ء، ص ۹

۲۔ تزک بابری، اردو ترجمہ، جلد دوم، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۹ء، ص ۱۶۹

۳۔ امیر خسرو، دیباچہ غرۃ الکمال، مطبع قیصریہ دہلی، ص ۶۶

۴۔ محمد عوفی، لباب الالباب، جلد دوم، مطبوعہ کیمبرج، ۱۹۰۲ء، ص ۲۴۶

۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۵۲

۶۔ خطبات گارساں دتاسی، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، ص ۳۰۴

۷۔ مظہر محمود شیرانی (مرتب)، مقالات حافظ محمود شیرانی مجلس ترقی ادب لاہور، جلد اول، ۱۹۷۰ء، ص ۲

۸۔ الیاس عشقی (مترجم) اردو کیا ہے از علامہ آئی آئی قاضی مرحوم مشمولہ اردو قومی یکجہتی اور پاکستان مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، ۱۹۹۲ء ص ۱۵۸

9-Turkish English Dictionary,H.C.Hony Oxford University Press 1967,page276

10-Ibide page 406

۱۱۔ حسن اختر ملک، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، یونیورسٹی بک ڈپو لاہور، ۱۹۷۹ء، ص ۳

۱۲۔ مظہر محمود شیرانی (مرتب)، مقالات حافظ محمود شیرانی، جلد اول، ص ۱۵، ۱۶

۱۳۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد، مرکزی اردو بورڈ لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۲۷

۱۴۔ قدرت نقوی (مرتب)، لسانی مقالات، حصہ دوم، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۸ء، ص ۱۳۵

اردوئے معلیٰ ٹیکسالی زبان تھی اور اس کے مقابلے میں دوسری علاقائی زبانوں کو معیاری نہیں سمجھا جاتا تھا۔[13] ۱۷۸۸ء میں پیر مراد شاہ نے اپنے ایک منظوم خط میں اردو استعمال کیا۔ مصحفی اور گلکرسٹ نے ۱۷۹۶ء میں اردو کا لفظ زبان کے لیے استعمال کیا۔ اس کے بعد یہ اتنا عام ہوا کہ ریختہ اور ہندی کے الفاظ اردو زبان کے لیے استعمال ہونا بند ہو گئے۔

۱۹۴۷ء آزادی کے بعد کچھ لوگوں نے اس زبان کا نام پاکستانی رکھنے کی تجویز پیش کی تو پورے ملک میں اس کے خلاف ردِ عمل کا اظہار کیا گیا۔ اگر اردو کی جگہ اس زبان کا نام پاکستانی رکھ دیا جائے تو بہت سی علاقائی زبانیں جو ہمارے بزرگوں کا قیمتی ورثہ ہیں اور اردو کے لیے معاون دریاؤں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کا وجود ختم ہو جائے گا اور ایک بڑا لسانی نقصان ہوگا۔[14] اردو صرف پاکستان تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ یہ زبان دنیا کے بیشتر علاقوں میں اسی نام سے جانی پہچانی جاتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ میمن عبدالمجید سندھی، ڈاکٹر، لسانیات پاکستان، مقتدرہ قومی زبان پاکستان اسلام آباد، ۱۹۹۲ء، ص ۹

۲۔ تزک بابری، اردو ترجمہ، جلد دوم مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۹ء، ص ۱۶۹

۳۔ امیر خسرو، دیباچہ غرۃ الکمال، مطبع قیصریہ دہلی، ص ۶۶

۴۔ محمد عوفی، لباب الالباب، جلد دوم، مطبوعہ کیمبرج، ۱۹۰۲ء، ص ۲۴۶

۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۵۲

۶۔ خطبات گارساں دتاسی، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، ص ۳۰۴

۷۔ مظہر محمود شیرانی (مرتب)، مقالات حافظ محمود شیرانی، مجلس ترقی ادب لاہور، جلد اول، ۱۹۷۰ء، ص ۲

۸۔ الیاس عشقی (مترجم) اردو کیا ہے از علامہ آئی آئی قاضی مرحوم مشمولہ اردو قومی یکجہتی اور پاکستان مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، ۱۹۹۲ء ص ۱۵۸

9-Turkish English Dictionary,H.C.Hony Oxford University Press 1967,page276

10-Ibide page 406

۱۱۔ حسن اختر ملک، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، یونیورسٹی بک ڈپو لاہور، ۱۹۷۹ء، ص ۳

۱۲۔ مظہر محمود شیرانی (مرتب)، مقالات حافظ محمود شیرانی، جلد اول، ص ۱۵، ۱۶

۱۳۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد، مرکزی اردو بورڈ لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۲۷

۱۴۔ قدرت نقوی (مرتب)، لسانی مقالات، حصہ دوم، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۸ء، ص ۱۳۵

اردو: ہند آریائی سے ہند یورپی تک

آریائی قوم ۱۵۰۰ قبل مسیح وسط ایشیا سے اٹھی۔ ان میں سے ایک گروہ مغرب کی جانب بڑھ گیا اور دوسرا گروہ آری نا (ایران) کی جانب۔ دوسرا گروہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک گروہ ایران ہی میں رہ گیا اور دوسرا گروہ ہندوستان میں اپنی سیاسی قوت، تہذیب و معاشرت کے ساتھ داخل ہو گیا۔ ہندوستان میں بھی آرین دو گروہوں میں بٹ کر آئے۔ ایک گروہ سندھ میں جا کر آباد ہوا اور دوسرا مدھیہ پردیش میں۔ ان آریائی گروہوں نے ہندوستانی باشندوں کو مغلوب کر کے یہاں اپنی حکومت قائم کی۔ آریہ قوم نے یہاں کی مفتوح قوموں کو نان آرین (غیر آریائی) اور شودر کا نام دیا۔ شرف الدین اصلاحی کی تحقیق کے مطابق سندھ آریہ جو زبان بولتے تھے اس سے سندھی اور مدھیہ پردیش کے آریاؤں کی زبان سے اردو نے جنم لیا۔ آریہ قوم ایران سے ہوتی ہوئی ہندوستان آئی تھی اس لیے ہماری ہند آریائی زبان کا تعلق ہند ایرانی سے ملتا ہے اور اس سے پہلے ہند یورپی سے۔[1]

آریاؤں کی زبان کے حوالے سے ڈاکٹر شجاع ناموس لکھتے ہیں:

"Aryans enterd India, horde after horde and tribe after tribe. This process started about

1500 B. C. and continued for about two centuries. They then spoke the Basic-Aryans language which was spoken by them on the shores of Caspian sea, in their orignal home. ...In India, after the settlement of Aryans in northern India, the Basic-Aryans language first adopted the shape of anti.Vedic language, somewhere between 1500 - 1200 B. C. which is differnt from the Basic-Aryans language but retains many features of the basic stock.[۲]

کچھ لوگوں کے خیال میں آریہ تبت سے آئے تھے،تقریباً سب محققین لسانیات کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آریہ لوگ وسطی ایشیا کے علاقوں سے آئے تھے۔ ڈاکٹر چٹر جی کا خیال ہے کہ قرون اولیٰ کی ہند یورپی زبان وتمدن کا گہوارہ یوریشیا کے وہ وسیع میدان ہیں جن کا سلسلہ ایک طرف پولینڈ اور جرمنی سے ملتا ہے اور دوسری طرف یورال پہاڑوں کے جنوب میں وسط ایشیا کے الطائی اور تھین شان کے سلسلہ ہائے کوہ سے۔ پروفیسر شریدر نے دریائے والگا کے دہانے کو آریوں کا اصل وطن قرار دیا۔ ان کے خیال میں تاریخی دھندلکے میں آریہ مغرب اور جنوب مشرق کی طرف پھیلنا شروع ہوتے ہیں۔ مغربی یورپ میں داخل ہونے والا گروہ مختلف شاخوں میں تقسیم ہوکر یورپ میں پھیل کر موجودہ آرمینین، یونانی، البینین، اٹیلین، کیلٹک، جرمن، سلوانک اور تکارین زبانوں کو جنم دیتا ہے۔ پروفیسر گیلس (Gelis) نے کیمبرج یونیورسٹی آف انڈیا میں آریوں کے پھیلنے کا مرکز آسٹریا ہنگری کو قرار دیا ہے۔ وسط ایشیا والے نظریے کی تائید ان ریکارڈوں سے ہوتی ہے جو ۱۹۰۶ء میں ایشیائے کوچک میں دریافت ہوئے اور جن کا تعلق ۱۵۰۰ ق م سے ہے۔ ان ریکارڈوں میں بعض دیوی دیوتاؤں کے نام (مثلاً اندرا، ارونا، میترا، وغیرہ) ملتے ہیں جنھیں مٹی کے حکمران پوجتے تھے یہ نام سنسکرت کی مقدس کتابوں میں جوں کے توں پائے جاتے ہیں۔ بالخصوص اعداد کی مماثلت سے یہ امر مسلم ہوجاتا ہے کہ آریہ کاکیشیا کے راستے سے ایشیائے کوچک اور مشرق کی طرف بڑھے ہوں

گے۔اس طرح اوستا کی فطری اور غیر مصنوعی زبان کے دونوں کناروں پر ہمیں خالص مصنوعی زبان کے نمونے ملتے ہیں۔مشرق میں سنسکرت اور مغرب میں ایشیائے کوچک کے نئے دریافت شدہ ریکارڈوں کی زبان۔یہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ آریہ ان دونوں مقاموں پر بیگانوں کی طرح رہے اور اپنی نسل اور زبان کو الگ تھلگ رکھا جیسا کہ ان کا عام دستور تھا اس کے برعکس ایران خاص میں ان کی زبان فطری طور پر بدل کر اس مصنوعی رجحان کو گنوا دیتی ہے۔ہندوستان میں آریوں کا سابقہ دراویدی اور آسٹرک زبانوں سے پڑا۔دراویدیوں سے مغربی اور شمال مغربی ہندوستان جبکہ آسٹرک سے مشرقی اور وسطی ہند میں مقابلہ ہوا۔[۳]

آریاؤں نے یہاں سنسکرت زبان کو رواج دیا جسے وہ اپنے ساتھ لائے تھے اور ایران میں جو ژند کہلاتی تھی۔آریوں کے ہندوستان میں آنے کے تقریباً چار سو سال کے بعد جب سنسکرت اپنے عروج پر تھی ان مہاتما آریاؤں کے دوسرے بھائیوں (فارسیوں) نے ہندوستان کا رخ کیا۔دارا شاہِ فارس پنجاب کی طرف بڑھا اور اسے فتح کر لیا۔اس طرح فارسی آریائی اور ہند آریائی زبانیں پھر باہم شکر شیر ہو گئیں یعنی ژند سنسکرت سے اور سنسکرت ژند سے مل گئی۔[۴] سنسکرت اور فارسی دو بہنیں تھیں۔[۵] آریاؤں اور سنسکرت زبان کے حوالے سے عین الحق فرید کوٹی لکھتے ہیں:

''آج سے کوئی ساڑھے تین ہزار سال قبل جب آریائی قبائل وادیٔ سندھ میں وارد ہوئے تو یہاں بسنے والے قبائل کی زبانوں کو مختلف ناموں سے یاد کیا۔کبھی اسے 'مردھر اواک' (غیر زبان) کا نام دیا۔یعنی ایسی زبان جو ان کی اپنی زبان سے بالکل مختلف تھی کبھی 'ناگ بانی' کے نام سے پکارا یعنی ایسی زبان جو ناگا قبائل بولتے تھے یا وہ زبان جو ناگ دیوتا کے ماننے والے استعمال کرتے تھے 'اسر بھاشا' یعنی وہ زبان جو یہاں کے غیر آریائی قبائل بولتے تھے اور 'ملیچھ بھاشا' یعنی ناپاک زبان قرار دیا۔جب ذرا بعد میں علم کا چرچا ہوا اور مختلف زبانوں کی تقسیم کا مسئلہ سامنے آیا تو آریائی زبان کے مقابلے میں مقامی زبانوں کو 'دیسا جا' یعنی دیسی زبانیں کہا گیا یعنی

وہ اپنی آریائی زبان کو غیر ملکی تصور کرتے تھے۔ زمانہ اور آگے بڑھا تو سنسکرت بمعنی فطری زبان کے مقابلے میں مقامی زبانوں کو پراکرت یعنی خودرو زبان اور 'اپ بھرنش' یعنی روبہ زوال زبان کا نام دیا گیا۔ غرضیکہ برہمنی گروہ سنسکرت جسے وہ دیوبانی تصور کرتے تھے اور مقامی زبانوں کے درمیان ہمیشہ ایک مصنوعی حد فاصل قائم رکھنے میں کوشاں رہا۔''(۶)

آریاؤں نے برصغیر کے لوگوں کی بود و باش، تہذیب و معاشرت اور رسم و رواج پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ہندوستان کی آب و ہوا اور زبان و بیان نے بھی ان نئے آنے والوں کو متاثر کیا۔ آریاؤں کی قدیم کتابوں اور ویدوں سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ہندوستانی بولیوں کے اثرات قبول کیے۔[۷] برہمنوں نے اپنی حیثیت اور شان کے مطابق سنسکرت کو وقار اور تقدس دینے کے لیے کچھ قاعدے اور قوانین وضع کیے۔ سنسکرت کے معنی پاک کے ہیں اسی لیے دوسرے مذہب کے لوگوں کے لیے اس زبان کا چکھنا چھوت اور منع تھا۔[۸] وہ زبان جو آریائی زبان اور دیسی زبانوں کے امتزاج سے بنی تھی اسی سے ویدی زبان اور سنسکرت کا ظہور ہوا۔ اور مختلف علاقائی بولیاں پراکرتیں بھی پیدا ہوئیں۔ سنسکرت میں منتخب اور بلیغ الفاظ رکھے گئے جبکہ علاقائی بولیوں نے ویدی زبان کے فطری اصولوں کو اپنے اندر سمو لیا۔ اسی لیے انھیں پراکرت کہا جانے لگا جس کے معنی فطری کے ہیں جو ذہنی تراش خراش سے محفوظ ہو۔ اور یہی عوام کی زبان ٹھہری۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سنسکرت اور جدید زبانوں کی اصل ایک ہی ہے لیکن یہ بات غلط ہے کہ کوئی جدید زبان سنسکرت سے پیدا ہوئی ہے۔[۹] بقول مرزا خلیل احمد بیگ:

''سنسکرت کے ارتقا اور فروغ کا زمانہ قدیم ہند آریائی عہد کہلاتا ہے جو ۱۵۰۰ قبل مسیح سے لے کر ۵۰۰ قبل مسیح تک قائم رہتا ہے۔ اس عہد میں سنسکرت زبان تو معرضِ وجود میں آتی ہی ہے، اس کی دو شکلیں بھی یکے بعد دیگرے نمودار ہوتی ہیں جنھیں ویدک سنسکرت اور کلاسیکی سنسکرت کہتے ہیں ویدک سنسکرت میں وید تصنیف کیے گئے اور کلاسیکی سنسکرت میں ادب کی

تخلیق عمل میں آئی۔"(۱۰)

آہستہ آہستہ سنسکرت کا ادبی مقام اور وقار بلند ہوتا گیا اور وہ آریائی اور علاقائی بولیوں سے ممتاز نظر آنے لگی۔ اور رفتہ رفتہ صرف اونچی سوسائٹی کی زبان بن گئی۔ ہندومت کی مذہبی اور ادبی تخلیقات کے لیے یہی زبان استعمال کی جانے لگی۔ ویدیں، اپنشدیں، سمرتیاں، مہابھارت، رامائن اور کالیداس کے ڈرامے اسی زبان میں لکھے گئے۔(۱۱) سلطنت ورعایا میں زبان کے فرق کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سی دوریاں پیدا ہوتی چلی گئیں اور آخر دونوں میں نفاق کا بیج پڑ گیا۔ عوام جس وقت کسی انقلاب کی راہ دیکھ رہے تھے اسی دور میں تقریباً ۵۷۷ق قبل مسیح سورج بنسی چھتریوں کے گھر گوتم بدھ پیدا ہوئے۔ مہاتما گوتم بدھ نے لوگوں کو ایک نئی تعلیم اور نجات کا راستہ دکھایا۔ مہاتما بدھ ذات پات اور اونچ نیچ کے قائل نہیں تھے انھوں نے عام انسانوں کو اپنی تعلیمات سے مستفید کیا اور یہ تعلیمات عام زبان میں دی گئیں تا کہ عام لوگ بات کو بآسانی سمجھ سکیں۔ بدھ مت کے پیرو اشوک نے اپنی تبلیغ کے لیے پراکرت کی ادبی شاخ پالی کو چنا اور اس طرح پالی کو بدھ مت کی تعلیمات کے ساتھ ساتھ عروج حاصل ہوا۔(۱۲)

بدھ مت پھیلنے کے بعد ۳۲۷ سال قبل مسیح یونانیوں نے برصغیر پر حملہ کر دیا۔ سکندر نے سندھ میں اپنے اردو کی چھاؤنی ڈال دی۔ ۱۹۵ سال ق م دیمتریئس (Demetrias) کے حملے سے ۵۰ء میں ہرمئیوس (Hermios) کی حکومت کے خاتمے تک یونان کی زبان کو حکمرانوں کی زبان ہونے کا شرف حاصل رہا۔ یونانی ہند میں دربار اور سرکاری کاموں کے لیے یونانی اور مقامی دونوں زبانوں کا استعمال کیا جاتا تھا۔ جس کا اندازہ اس عہد کے سکوں کی تحریروں سے لگایا جاسکتا ہے۔ ان سکوں کے ایک طرف یونانی اور دوسری طرف مقامی زبان 'خروشتی' رسم الخط میں کندہ ہے۔(۱۳)

جین مت نے یونانیوں کے حملہ کے بعد ۱۹۵ سال ق م میں بدھ مت کی عظیم الشان عمارت کو ہلا کر رکھ دیا اور ہندو دھرم میں دوبارہ جان ڈال دی جس کی وجہ سے سنسکرت نے بھی نیا جنم لیا۔ لیکن مختلف پراکرتوں کے آگے سنسکرت زیادہ عروج حاصل نہ کر سکی۔ ۱۲۶ سال ق م

یونانیوں کے بعد تاتاری ہندوستان پر حملہ آور ہوئے اس کے بعد ترکی اور چنگیز و تیمور کی فوجوں نے دھاوا بول دیا آخر فارسی، یونانی اور ترکی زبانیں یہاں کی زبانوں پر اثر انداز ہوئیں اور یہاں کی زبانوں کا جزوِ لاینفک بن گئیں۔[۱۴] کشن عہد ۴۰ء تا ۳۶۰ء میں مقامی زبانوں خروشتی اور براہمی کے ساتھ یونانی تحریر بھی استعمال ہوتی رہی۔[۱۵] انڈو یونانی عہد ساکوں کے دور اقتدار یعنی ۱۳۶ بعد مسیح تک چلا۔[۱۶]

مسلمانوں کے برصغیر میں آنے سے قبل ہی بدھ مذہب کا اختتام ہو چکا تھا اور بہت سی قوتیں ہندوستان میں فتوحات کے جھنڈے گاڑ کر پسپا ہو چکی تھیں۔ مگر ان کے اثرات ابھی تک باقی تھے اور پراکرت بھی کسی نہ کسی روپ میں مختلف شکلیں بدلتی ہوئی وقت کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ تقریباً چھ سو سن عیسوی کے لگ بھگ پراکرت کی ادبی شاخ اور عوام کی بولیوں میں دوری پیدا ہوتی چلی گئی۔ اس دور کے زبان دانوں نے عوام میں مقبول بولیوں کو ''اپ بھرنش'' کہہ کر پکارنا شروع کر دیا۔ جس کے معنی ہیں بگڑی ہوئی زبان۔ شروع میں اپ بھرنش نے بہت مقبولیت حاصل کی لیکن راجپوتوں کے زوال کے ساتھ ہی اپ بھرنش غیر مقبول ہونے لگی اور اس کے بطن سے پنجابی، گجراتی، راجستھانی، بنگالی، مرہٹی، اڑیا، بہاری، مشرقی ہندی اور مغربی ہندی نے جنم لیا۔ مغربی ہندی کی ایک شاخ کو کھڑی بولی بھی کہا جاتا ہے۔ جو کہ دہلی اور دہلی کے قرب و جوار میں بولی جاتی تھی۔ شورسینی دوآبہ گنگا جمنا کے علاقے میں مروج تھی اور آگے چل کر اسی کا نام برج بھاشا پڑ گیا۔[۱۷]

''کیکر'' جمنا سے لے کر قدیم درشداوتی کے علاقوں میں بولی جاتی تھی اور ہریانوی اس کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ درشداوتی سے دریائے اٹک تک یعنی پورے پنجاب میں ''پشاچی'' بولی مروج تھی۔ موجودہ پنجابی، مالوئی، دوآبی، ماجھی، سرائیکی (بالائی سندھ کی پنجابی)، ملتانی، لمی، دھنی، پوٹھوہاری، پہاڑی اور ہندکو وغیرہ کا تعلق اسی پشاچی بولی سے ہے۔

اردو زبان کے مآخذ کے بارے میں مختلف نظریات ملتے ہیں۔

سید سلمان نے اردو کا تعلق سندھی سے جوڑا ہے کہ مسلمان سب سے پہلے سندھ

میں فاتح بن کر آئے تھے لہٰذا عربی اور سندھی کے ملاپ سے جو نئی زبان تخلیق ہوئی وہ اردو ہے۔ ان کے خیال میں اردو زبان کا ہیولیٰ وادیٔ سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ''اردو زبان کا ارتقا'' میں پالی کو اردو زبان کا ماٰخذ قرار دیا ہے لیکن انھوں نے اپنی دوسری کتاب ''داستان زبان اردو'' میں خود اس بات کی تردید کر دی ہے۔

عین الحق فرید کوٹی اردو کو ہڑپہ اور موہنجوداڑو کی مقامی بھاشا کا تسلسل قرار دیتے ہیں اور اسے دراوڑی زبان کی باقیات میں سے شمار کرتے ہیں۔

ماہر لسانیات ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اپنے نظریہ میں ہریانی کو اردو زبان کا ماٰخذ قرار دیا ہے۔ جو کہ اپ بھرنش کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔

نصیر الدین ہاشمی نے اردو کی ابتدا کا سراغ دکن میں لگایا ہے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے مطابق اردو کا سنگِ بنیاد مسلمانوں کی فتح دہلی سے بہت پہلے رکھا جا چکا تھا۔ اردو اس زبان سے پیدا ہوئی ہے جو نئے ہند آریائی دور میں شمالی سرحدی صوبہ اور الہ آباد کے درمیانی علاقے میں بولی جاتی تھی۔

پروفیسر کمار چٹر جی نے بھی اس نظریہ کی تائید کی ہے کہ مسلمانوں نے جو زبان اپنائی وہ اس دور میں پنجاب میں مروج تھی۔ وہ پنجابی اور اردو کے مابین مضبوط رشتے کے قائل ہیں اور وہ پنجابی کے ساتھ ساتھ دہلی کے گردونواح میں بولے جانے والی زبان کھڑی بولی کو بھی اردو کے قریب سمجھتے ہیں۔ پروفیسر احتشام حسین بھی اردو کا ماخذ کھڑی بولی ہی کو قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر سہیل بخاری مہاراشٹر کے مشرقی علاقے کو اردو کی جائے پیدائش قرار دیتے ہوئے اردو کو مرہٹی کی سگی بہن کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

شروع شروع میں اردو کا ماٰخذ برج بھاشا کو سمجھا جاتا تھا۔ محمد حسین آزاد نے اردو کو برج بھاشا کی بیٹی قرار دیا ہے۔ مگر حافظ محمود شیرانی نے ''پنجاب میں اردو'' کے ذریعہ تحقیق کر کے اس بات کو چیلنج کیا اور اردو زبان کے ڈانڈے پنجابی زبان سے ملا دیے۔ یہ بات طے

ہے کہ برج بھاشا نے شورسینی کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور یہ گنگا و جمنا کے دوآبہ سے نکل کر آگرہ، بھرتپور، گوالیار، جے پور، گڑگاؤں، بدایوں بریلی، اور علی گڑھ کے علاقوں میں بولی جانے لگی۔ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے وقت اسی زبان کی مقبولیت تھی۔ جب ہم اردو کا برج بھاشا اور پنجابی زبان سے موازنہ کرتے ہیں تو یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ مصدر کا قاعدہ، صرف ونحو، تذکیر و تانیث اور گرائمر کے اصولوں میں اردو زبان برج بھاشا کی بجائے پنجابی زبان سے زیادہ قریب ہے۔ پنجابی اور اردو زبان نے ایک ہی جگہ پرورش پائی ہے۔ دونوں کا جنم بھومی ایک ہی ہے بعد میں یہ زبانیں الگ ہوگئیں اور دوسری زبانوں کے اثرات اردو زبان نے قبول کرنا شروع کر دیے۔[۱۸]

حافظ محمود شیرانی کی کتاب ''پنجاب میں اردو'' لسانی حوالے سے اہمیت کی حامل ہے انھوں نے اس کتاب میں فرمایا ہے کہ اردو زبان صرف ونحو کے حوالے سے پنجابی اور ملتانی زبان سے مشابہ ہونے کی وجہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اردو پنجابی زبان سے نکلی ہے۔

برجموہن دتاتر یہ کیفی اپنی کتاب ''کیفیہ'' میں اردو زبان کی ابتدا کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اردو زبان پر شمال اور شمال مغربی ہند کی زبانیں اپنے اثرات مرتب کرتی رہی ہیں۔

زمانہ قدیم میں ہندوستان کی مختلف بولیوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا مثال کے طور پر کھڑی بولی، ہریانوی، برج بھاشا اور پنجابی کے بہت سے الفاظ ایک جیسے تھے۔ ان بولیوں میں معمولی اختلاف تھا۔ اس علاقے کے لوگوں میں پیار، محبت اور میل جول زیادہ تھا یہی وجہ تھی کہ وہ ایک دوسرے کی بولی کو بآسانی سمجھ لیتے تھے۔ لیکن جوں جوں معاشرے میں، مختلف قوموں اور قبیلوں میں تہذیب وتمدن کا فرق بڑھتا گیا، مختلف زبانوں میں بھی اجنبیت کی دیوار حائل ہوتی چلی گئی۔[۱۹] سنسکرت ایک بند زبان بن گئی اور اس نے دوسری زبانوں سے میل جول ختم کر لیا جبکہ اپ بھرنش نے مختلف علاقوں کی زبانوں کے الفاظ کو اپنایا اور دیسی زبانوں کی لغات کو بھی اپنے دامن میں بھر لیا یہی وجہ ہے کہ اپ بھرنش برصغیر کے مختلف علاقوں میں بولی جانے لگی اور اس نے جدید آریائی روپ دھار لیا۔[۲۰] بقول مرزا خلیل احمد بیگ:

''قدیم ہند آریائی عہد میں علاقائی سطح پر شمال مغرب تا مشرق سنسکرت زبان کی تین شکلیں رائج تھیں، جنھیں ادیچیہ، پراچیہ اور مدھیہ دیشہ کہتے ہیں ادیچہ شمال مغربی خطے کی بولی تھی، پراچیہ کا چلن مشرق میں تھا اور مدھیہ دیشہ ادیچہ اور پراچہ کے درمیانی علاقے کی بولی تھی یہ وہی علاقہ ہے جہاں بعد کے دور میں شورسینی پراکرت پروان چڑھی جس سے شورسینی اپ بھرنش نکلی اور جس سے پھر مغربی ہند کی بولیاں وجود میں آئیں جن میں سے ایک بولی کھڑی بولی، اردو کی پیدائش کا سبب بنی۔''(۲۱)

سیاسی انتشار اور مختلف علاقوں کی آپس میں علیحدگی کے بعد ہر علاقے کی اپ بھرنش علیحدہ ہوگئی۔ کہیں اسے پساچی اپ بھرنش کہا گیا، کہیں شورسینی اپ بھرنش۔ ایک علاقے میں یہ ماگدھی اپ بھرنش کہلائی تو دوسرے علاقے میں اردھ ماگدھی اپ بھرنش، اور کہیں اسے مہاراشٹری اپ بھرنش کے نام سے موسوم کیا گیا۔ ان سب اپ بھرنش زبانوں میں شورسینی اپ بھرنش سب سے زیادہ مقبول ہوئی اور اس شورسینی اپ بھرنش سے اردو زبان ماخوذ ہے۔(۲۲) شوکت سبزواری لکھتے ہیں کہ اردو نے جس قدیم اپ بھرنش سے ارتقا پایا اس کی شکل موجودہ اردو سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔(۲۳)

عرب لوگ عرصہ دراز سے ہندوستان کے مالابار اور کارومنڈل کے ساحلی علاقوں میں تجارت کی غرض سے آتے جاتے تھے جن کی وجہ سے ساحلی علاقوں کی زبانوں میں عربی الفاظ اس طرح شامل ہوگئے کہ جیسے ان زبانوں کا حصہ ہوں۔ ۷۱۲ء میں مسلمان محمد بن قاسم کی قیادت میں فاتح بن کر ہندوستان میں وارد ہوئے، انھوں نے سندھ میں جو حکومت قائم کی وہ سینکڑوں برس تک برقرار رہی۔ عربوں کے اثرات کی وجہ سے موجودہ سندھی زبان رائج ہوئی جو عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔

محمد بن قاسم جب ہندوستان میں آیا تو ان علاقوں میں پساچی اور شورسینی زبانوں کا رواج تھا جبکہ محمد بن قاسم اپنے ساتھ عربی اور فارسی زبان بولنے اور سمجھنے والی فوج لے کر آیا۔ عربی زبان کی وجہ سے سندھی زبان کے تمدنی سرمائے میں اضافہ ہوا۔ فوج میں جو فارسی

زبان بولتے تھے ان کی زبان بھی عربی سے متاثر تھی۔[۲۴]

محمود غزنوی نے (۱۰۰۱ء۔۱۰۳۳ء) برصغیر پر حملہ کیا تو اس وقت مسلمان ہندوستان میں اہم اور مسلمہ حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ غزنوی کے ساتھ آنے والے مسلمان فارسی زبان بولتے تھے۔ عربوں کی فتح ایران اور عربی کے مختلف زبانوں پر اثرات کی وجہ سے زبان ایک نئے آہنگ اور نئے روپ سے روشناس ہوئی۔ یہ نئے ادبی زاویوں سے ہمکنار ہوئی۔ عربی کے بعد فارسی دنیائے اسلام کی سب سے بڑی زبان تھی۔ محمود غزنوی نے سندھ، ملتان اور پنجاب سے لے کر میرٹھ دہلی کے نواحی علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا اور یہ حکومت تقریباً پونے دوسوسال تک قائم رہی۔ محمود غزنوی کے حملے تک تقریباً دوسو برس میں مسلمانوں نے یہاں کی مختلف زبانوں اور علوم پر دسترس حاصل کرنا شروع کردی تھی اور یہ زمانہ زبان کے حوالے سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ مسعود سعد سلمان (۱۱۲۱ء متوفی) بھی اسی دور کا شاعر ہے جس نے فارسی، عربی اور ہندی زبان میں دیوان مرتب کیا۔[۲۵]

وہ قومیں جو عربی اور فارسی بولتی تھیں ہندوستان کے نزدیک ہی بودوباش رکھتی تھیں۔ چونکہ اس زمانہ میں عربی زبان نہایت ترقی پر تھی اور اس میں علمی تحقیقات اور علمی اصطلاحات موجود تھیں اور علوم وفنون میں بہت ترقی کرگئی تھیں، اس لیے یہ زبان فارسی زبان سے مل گئی ہم کہہ سکتے ہیں کہ عربی اپنے زمانہ میں سب زبانوں پر غالب تھی اور فارسی اس کی معاون تھی۔ پراکرت جس کو بھاشا بھی کہتے ہیں اس میں غیر زبان کے الفاظ داخل ہوگئے۔[۲۶]

اسی زمانے میں اسلامی دنیا کے نامور محقق اور عالم البیرونی نے ہندوستان کا سفر کیا اور بہت عرصہ یہاں قیام فرمایا البیرونی نے ہندوؤں کے فلسفہ، مذہب اور تہذیب کا بغور مشاہدہ اور مطالعہ کر کے ''کتاب الہند'' تصنیف کی۔ اپنی تصنیف کے مواد کے لیے البیرونی کو مختلف بہروپ بھر کے مندروں اور مذہبی تقریبات میں بھی جانا پڑا اور اس نے ہندوؤں کی سماجی اور معاشرتی اقدار کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان شروع دن ہی سے علم کے جویا تھے۔ برصغیر کے مقامی لوگوں سے جب مسلمانوں کا میل جول بڑھا تو ایک دوسرے

کی زبان کے الفاظ بولنے کی وجہ سے دونوں کی زبانوں میں کچھ مشترک الفاظ کا ذخیرہ جمع ہو گیا اور عوام میں زبانوں کے الفاظ کا لین دین بڑی تیزی سے شروع ہو گیا۔ یوں آہستہ آہستہ ایک نئی زبان کا خاکہ تیار ہونے لگا۔

بارھویں صدی کے آخر میں معز الدین غوری (۱۱۹۲ء) نے پرتھوی راج اور جے چند کو شکست دے کر منگھیر تک اسلامی سلطنت قائم کر دی۔[۲۷] اس وقت ان علاقوں میں دور دور تک حضرت داتا گنج بخش اور سخی سلطان سرور کی تعلیمات اور فیوض کا دور دورہ تھا۔ ۱۲۰۶ء میں سلطان قطب الدین ایبک نے شمالی ہندوستان فتح کر لیا اور دہلی کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے روابط مزید گہرے ہو گئے۔ اس وقت شورسینی اپ بھرنش کی شاخ مغربی ہندی سے برج بھاشا اور کھڑی بولی معرض وجود میں آ چکی تھیں۔ دہلی میں مسلمانوں کے قیام کی وجہ سے دیسی بولیوں میں فارسی زبان کے الفاظ شامل ہونا شروع ہو گئے اور مسلمان بھی یہاں کی مقامی بولیوں میں مہارت حاصل کرتے چلے گئے۔ یہ بات طے ہے کہ مسلمان فوج جو قطب الدین ایبک کے ساتھ آئی تھی اس کا بیشتر حصہ پنجابی زبان بولتا تھا اور جب یہ پنجابی زبان فارسی، کھڑی بولی اور برج بھاشا سے ملی تو ایک نئی زبان پروان چڑھنے لگی، پنجاب کے لوگ اس کے بانی تھے۔[۲۸]

''امیر خسرو نے ''نہہ سپہر'' میں دہلی اور اس کے گرد و نواح میں بولی جانے والی زبانوں کے حوالے سے لکھا ہے۔

سِندی، لاہوری و کشمیر و ڈُگر
دھور سمندری، تلنگی و گُجر
معبری گوڑی و بنگال و اوَد
دہلی و پیرامنش، اندر ہمہ حد

یہاں خسرو نے بارہ زبانوں کا ذکر کیا ہے۔۔۔ ان میں غیر آریائی زبان تلگو (نمبر ۶) بھی شامل ہے۔[۲۹]

خسرو کے عہد میں ہندوستان کے مختلف حصوں میں جو زبانیں رائج تھیں اور جن کا ذکر انھوں نے اپنی مثنوی نہ سپہر میں کیا ہے حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ سندی (سندھی)

۲۔ لاہوری (پنجابی)

۳۔ کشمیر (کشمیری)

۴۔ ڈگر (ڈوگری)

۵۔ دھور سمندری (دوار سمندری)

۶۔ تلنگی (تلگو)

۷۔ گُجر (گجراتی)

۸۔ معبری (کارومنڈل کے ساحل کی تامل)

۹۔ گوڑی (آسامی)

۱۰۔ بنگال (بنگالی)

۱۱۔ اود (اودھی)

۱۲۔ دہلی و پیرامنش (دہلی ونواح دہلی) (۳۰)

علاؤالدین خلجی نے ۱۲۹۴ء میں جنوبی ہند پر فوج کشی کی اور دکن فتح کر لیا۔ یہ علاقہ تقریباً سو سال تک سلطنتِ دہلی میں شامل رہا۔ یوں گجرات، دکن اور دہلی ایک ہی ہو گئے۔ علاؤالدین خلجی نے سارے علاقے کو انتظامی نقطہ نظر سے مختلف حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصہ پر ایک ترک افسر تعینات کر دیا۔ اس طرح بے شمار ترک خاندان اپنے متوسلین کے ساتھ جنوبی ہند میں آباد ہو گئے۔ یہ لوگ شمالی ہند سے اپنے ساتھ وہ زبان بھی لے کر گئے جو اس وقت دلی کے قرب وجوار میں بولی جا رہی تھی۔ مختلف بغاوتوں سے تنگ آ کر محمد تغلق نے ۱۳۲۷ء میں اپنا دارالحکومت دولت آباد منتقل کر دیا۔ اور فرمان جاری کیا کہ دہلی کی ساری آبادی دولت آباد ہجرت کر جائے۔ اس طرح دہلی کے گلی کوچوں میں بولے جانے والی زبان دولت آباد منتقل ہو گئی۔ محمد تغلق کے آخری زمانہ میں امیران صدہ نے حکومت کے خلاف بغاوت کر

دی اور ۱۳۴۷ء میں دکن کی سلطنت کی بنیاد ڈال دی۔ اب جنوبی ہند میں جن ترک خاندانوں کے پاس حکومت تھی وہ اپنے آپ کو دکنی کہلانے پر فخر محسوس کرتے تھے اور ان کی زبان بھی دکنی کہلاتی تھی۔ جسے خافی خاں نے ہندوی قرار دیا ہے۔[۳۱]

فارسی اور دیسی بولیوں سے مل کر بننے والی زبان جو آگے چل کر اردو کہلائی، اس میں پنجابی، راجستھانی، برج بھاشا اور کھڑی بولی کے اجزا شامل تھے لیکن آہستہ آہستہ یہ بولی کھڑی بولی کے قریب تر ہوتی چلی گئی۔ کھڑی بولی کو بنیادی اہمیت اس لیے بھی حاصل ہے کہ دہلی کے بادشاہ اپنی فوج میں انبالہ، کرنال، حصار اور میواڑ کے علاقوں سے جوان بھرتی کیا کرتے تھے اور ان علاقوں میں کھڑی بولی کا رواج تھا۔ کھڑی بولی دہلی کی زبان ہونے کی وجہ سے تاجر پیشہ لوگوں اور حکومتی کارندوں کے ذریعے ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئی۔

اردو مختلف بولیوں اور زبانوں کے امتزاج اور اختلاط کا نتیجہ ہے۔ اس میں جتنا بھی ذخیرہ الفاظ ہے اور اس کے جو قواعد ہیں وہ سب دوسری زبانوں سے مستعار لیے گئے ہیں۔ اس کے باوجود یہ ایک آزاد اور خود مختار زبان کی حیثیت کی حامل ہے۔ مختلف سیاسی، سماجی اور تہذیبی عوامل نے اس زبان کو متاثر کیا اور اس کی پرداخت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ اردو زبان وادب کا پنجاب کی سرزمین سے قریبی تعلق رہا ہے۔ وہ زبان جو مختلف ادوار میں دہلی سے دکن، گجرات۔ مالوہ اور دوسرے صوبوں میں پہنچی اس پر پنجاب کا اثر سب سے گہرا ہے۔ جب ہم قدیم گجری اور دکنی ادب کے نمونوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان پر پنجابی کے گہرے نقوش نظر آتے ہیں۔[۳۲] معلوم ہوتا ہے کہ اردو کا آغاز پنجاب کی سرزمین سے ہوا بعد میں یہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی میں آئی جہاں اس نے گردونواح کی بولیوں کے اثرات کی وجہ سے ایک نئی زبان کی حیثیت اختیار کر لی۔ جو آگے چل کر ''اردو'' کہلائی۔

یہ اردو زبان سے کسی خاص نسل یا دور سے متعلقہ نہیں ہے یہ سینکڑوں برسوں میں مختلف نسلوں کی کوششوں اور مختلف زبانوں کے اشتراک واختلاط کا نتیجہ ہے۔ البتہ جہاں تک زبانوں کے شجرے کا تعلق ہے اردو ''اندو آریائی'' گھرانے سے ہے جو ''اندو یورپین'' گھرانے

کی ایک شاخ ہے۔اس طرح اردو کا تعلق ایشیا اور یورپ کی مختلف زبانوں سے قائم ہو جاتا ہے۔اس کے باوجود یہ ایک خالصتاً آریائی زبان نہیں ہے بلکہ مختلف نسلوں کی زبانوں نے مل کر اس کی پرورش کی ہے۔[۳۳]

تحقیق لسانیات (Linguistics) کے لحاظ سے ہندی، سنسکرت (اور اردو، جو ہندی یا ہندوی ہی سے برآمد ہوئی ہے) اور علاوہ ازیں فارسی بھی Ind-European (ہند یورپی) زبانوں کے گروہ عظیم سے تعلق رکھتی ہے۔جب کہ عربی زبان، سامی زبانوں (Semitic languages) کا حصہ ہے۔{جن میں عبرانی (Hebrew)، سریانی (Seraic) وغیرہ شامل ہیں} اور ترکی ایک بالکل ہی الگ گروہ (Group) سے تعلق رکھتی ہے، یعنی Altaic-ugric-finnic گروپ (جس میں منگولین، ہنگرئین اور فنش وغیرہ زبانیں شامل ہیں۔لہٰذا جو اجزا ہماری زبان (اردو یا ہندوستانی یا ہندوی) میں فارسی، بلکہ انگریزی اور پرتگیزی سے داخل ہوئے ہیں، ان کا اردو میں گھلنا ملنا (آمیخت ہونا) زیادہ فطری ہونا چاہیے، نہ کہ عربی کا، لیکن دراصل عربی کی بالا دستی یا Dominance کی وجہ مذہب اسلام ہے، جو عرب سے نکلا تھا اور چوں کہ زبانِ اردو ہندوستان میں زیادہ تر مسلمانوں کی زبان تھی (جیسا کہ بہت سے ہندو کہتے چلے آئے ہیں۔) اس لیے اردو میں خود فارسی زبان ہی کی طرح، عربی عناصر بڑی کثرت سے شامل ہو گئے۔دراصل اردو زبان میں فارسی کے اثرات اس لیے بھی گہرے ہوتے گئے کہ ہندوستان میں تقریباً آٹھ سو سال تک جن مسلمانوں کی حکومت رہی وہ فارسی زبان بولتے تھے۔اسی طرح ترکستان اور ازبکستان سے جو ترک ہندوستان میں آئے (یعنی مغل بادشاہ اور ان کے متوسلین) ان کی درباری زبان بھی فارسی تھی۔اگرچہ گھروں میں وہ ترکی بولتے تھے چنانچہ اردو زبان میں ترکی الفاظ آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔[۳۴]

اردو زبان مختلف علاقائی زبانوں اور بولیوں سے مل کر وجود میں آئی ہے۔آج بھی پاکستان اور بھارت کے بیشتر علاقوں میں وہ بولیاں بولی جاتی ہیں جن سے اردو زبان نے استفادہ کیا ہے۔ان لوگوں کی ایک کثیر تعداد تقسیم ہند کے نتیجے میں ہجرت کر کے پاکستان آ بسی

ہیں۔ انھیں بولیوں کے حامل لوگوں کی اگلی نسلیں جو کہ پڑھ لکھ جاتی ہیں اردو زبان کو اپنا لیتی ہیں کیونکہ ان کی بولیوں کی ترقی یافتہ شکل اردو کے نام سے جانی پہچانی جاتی ہے۔

اردو عوامی رابطے کے لیے ایک آسان اور مقبول زبان ہے جس کا تعلق براہِ راست عوام سے ہے۔ قطع نظر اس کے کہ اردو کا ماخذ کونسی زبان ہے یا اردو کس زبان سے نکلی ہے اس میں ہر خطے اور علاقے کی مختلف بولیوں کے اثرات پائے جاتے ہیں اور یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اردو میں دوسری زبانوں کے لفظی اور علمی ولسانی سرمائے کو اپنانے اور اپنے مزاج کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے اسی وجہ سے مقبول و معروف اور ہر دلعزیز زبان ہونے کا شرف حاصل ہے۔

حوالہ جات

۱۔ شرف الدین اصلاحی، اردو سندھی کے لسانی روابط، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۷ء، ص ۷

2.Dr. Shuja Namus,Origin of Shina Language,Pakistani Language Edited by Anwar S. Dil, Linguistic Research Group of Pakistan, Lahore, 1963, page.56

۳۔ مسعود حسین خاں' ڈاکٹر، تاریخ زبان اردو، اردو مرکز لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۹ تا ۱۱

۴۔ نصیر حسین خیال، داستان اردو، ادارہ اشاعت اردو حیدر آباد دکن، س ن، ص ۱۳

۵۔ محمد حسین: اردو ناگری کی (۲) بحث پنجاب میں، پاکستان میں اردو، چوتھی جلد پنجاب، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ۳۷۲

۶۔ عین الحق فرید کوٹی، اردو زبان کی قدیم تاریخ، اورینٹ ریسرچ سنٹر لاہور، طبع سوم، ۱۹۸۸ء، ص ۵۳، ۵۴

۷۔ میمن عبدالمجید سندھی، ڈاکٹر، لسانیات پاکستان، ص ۱۲

۸۔ نصیر حسین خیال، داستان اردو، ص ۱۴

۹۔ خلیل صدیقی، زبان کیا ہے، بیکن بکس ملتان، ۱۹۸۹ء، ص ۲۴۸

۱۰۔ خلیل احمد بیگ' مرزا، اردو زبان کی تاریخ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۷ء، ص ۴۰۲

۱۱۔ عین الحق فرید کوٹی، اردو زبان کی قدیم تاریخ، طبع سوم، ص ۴۷

۱۲۔ شبیر علی کاظمی' سید، پراچین اردو، مکتبہ اسلوب کراچی، ۱۹۸۲ء، ص ۱۹

۱۳۔ عین الحق فرید کوٹی، اردو زبان کی قدیم تاریخ، ص ۲۸۸

۱۴۔ نصیر حسین خیال، داستان اردو، ص ۱۶، ۱۷، ۱۸

۱۵۔ عین الحق فرید کوٹی، اردو زبان کی قدیم تاریخ، ص ۲۵۹

۱۶۔ رشید اختر ندوی: پاکستان کا قدیم رسم الخط اور زبان، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء، ص ۱۸۱

۱۷۔ عین الحق فرید کوٹی، اردو زبان کی قدیم تاریخ، ص ۷۸

۱۸۔ شیرانی، الحافظ محمود، پنجاب میں اردو، حصہ اول، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۸ء، ص ۸۶

۱۹۔ قدرت نقوی (مرتب)، لسانی مقالات، حصہ دوم، ص ۱۶

۲۰۔ دی امپیریل آف گزیٹر آف انڈیا، جلد اول، آکسفورڈ ۱۹۰۹ء، ص ۳۵۸

۲۱۔ خلیل احمد بیگ، مرزا، اردو زبان کی تاریخ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۷ء، ص ۳۰۴

۲۲۔ شرف الدین اصلاحی، اردو سندھی کے لسانی روابط، ص ۲۸

۲۳۔ شوکت سبزواری، داستان زبان اردو، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۰ء، ص ۱۱۱

۲۴۔ شرف الدین اصلاحی، اردو سندھی کے لسانی روابط، ص ۸۰

۲۵۔ عوفی، لباب الالباب، جلد دوم، مطبوعہ کیمبرج، ۱۹۰۲ء، ص ۲۴۶

۲۶۔ محمد حسین: اردو ناگری کی (۲) بحث پنجاب میں، پاکستان میں اردو، چوتھی جلد پنجاب، مقتدرہ قومی زبان

اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ۳۷۲،۲

۲۷۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، ص ۳۶

۲۸۔ محمد اکرم چغتائی، پنجاب میں اردو (مزید تحقیق)، مشمولہ فنون لاہور، غالب نمبر، ۱۹۶۹ء، ص ۳۷۱

۲۹۔ صفدر آہ، ڈاکٹر، ایک خط، ''افکار'' کراچی، جولائی ۱۹۶۶ء، ص ۱۰۱

۳۰۔ مسعود حسین خاں: اردو کی ابتدا سے متعلق چند مشاہدات، اردو زبان کی تاریخ مرتبہ مرزا خلیل احمد بیگ،

ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۷ء، ص ۳۴

۳۱۔ خافی خاں، منتخب اللباب، جلد سوم، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ، ۱۹۲۵ء، ص ۳۰۷

۳۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو جلد اول (قدیم دور)، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۵ء ص ۲۲

۳۳۔ شبیر علی کاظمی، سید، پراچین اردو، ص ۱۷

۳۴۔ سعید اختر درانی، ڈاکٹر، اردو پر بیرونی زبانوں کے اثرات، اخبار اردو اسلام آباد، ستمبر ۲۰۰۸ء، ص ۵۲

اردو شمالی ہند میں

اردو زبان وادب کے ارتقا میں شاعروں، ادیبوں کے علاوہ صوفیوں، رشیوں اور بھگتوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے اپنے خیالات کی ترسیل کے ذریعہ اردو زبان ملک کے گوشے گوشے میں پہنچادی۔ ان بزرگوں کے مختلف سلسلے تھے جو مختلف علاقوں میں احیائے دین کے لیے کام کررہے تھے۔ ان بزرگوں کے اقوال اور ملفوظات اردو نظم ونثر کے ارتقا میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں ان کا مقصد زبان کی تراش خراش نہیں تھا بلکہ یہ آسان فہم اور سادہ زبان میں ہر مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے لوگوں تک اپنے دل کی بات پہنچاتے تھے۔

شمالی ہند میں اردو نظم ونثر کے فروغ کے لیے جن لوگوں کا نام لیا جاتا ہے ان میں سب سے پہلا نام مسعود سعد سلمان (۱۱۲۱ء متوفی) کا ہے، جس نے ابراہیم غزنوی (۱۰۵۹ء تا ۱۰۹۹ء) کے زمانہ میں فارسی اور عربی کے علاوہ ہندوی میں بھی دیوان مرتب کیا جواب ناپید ہے۔ بارھویں صدی عیسوی میں ہری اودھ کی نثری تحریریں ملتی ہیں جو اردو زبان سے مشابہ ہیں۔[1]

حضرت معین الدین چشتی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ہندی زبان میں بات چیت شروع کی۔

حضرت فرید الدین گنج شکر (۱۱۸۶ء تا ۱۲۶۵ء) کے کئی اقوال دستیاب ہوئے ہیں

جو ہندی زبان میں ہیں۔ان کے بعد شیخ شرف الدین بوعلی قلندر کے ہندی زبان میں دوہے بھی ملتے ہیں۔

امیر خسرو (۱۲۳۶ء تا ۱۳۲۵ء) کا نام شاعری اور موسیقی کے حوالے سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔انھیں نئی نئی چیزیں اختراع کرنے کا بہت شوق تھا۔ہندوستانی زبانوں سے انھیں خوب واقفیت حاصل تھی۔انھیں ریختہ کی پہلی تحریک کا بانی شمار کیا جاتا ہے۔[۲] انھوں نے ہندوی میں بھی دیوان تیار کیا۔ان کی طرف بہت سی کہہ مکرنیاں اور پہیلیاں منسوب ہیں۔

شاہ نصیر الدین چراغ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے مریدوں سے ہندوی میں بات کیا کرتے تھے۔تاریخ فرشتہ میں ان کا ایک ہندوی فقرہ ملتا ہے جو انھوں نے شیخ عثمان سے کہا تھا۔''تم اوپروہ تل''اس کے علاوہ شیخ برہان الدین غریب (متوفی ۱۳۳۸ء)، شیخ سراج الدین اخی سراج (متوفی ۱۳۶۵ء)، حضرت گنج العلم (متوفی ۱۳۹۳ء)، مظفر بلخی (۱۴۰۰ء)، خواجہ بندہ نواز گیسودراز (۱۴۲۲ء) اور دوسرے بہت سے صوفیائے کرام نے ہندوی میں رسالے تصنیف کیے اور اسی زبان میں رشد وہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔خواجہ بندہ نواز کی سب سے اہم تصنیف معراج العاشقین ہے۔ان کی تصانیف میں ہدایت نامہ اور سہ بارہ بھی کافی مشہور ہیں۔چودھویں صدی عیسوی میں گورکھ ناتھ نے ہندوی میں نثر لکھی۔گورکھ ناتھ کی نثر برج آمیز راجستھانی میں ہے۔

برہان الدین قطب عالم (متوفی ۱۴۴۶ء) اور ابوالبرکات شاہ عالم (متوفی ۱۴۷۵ء) دونوں سے ہندوی زبان میں کچھ فقرے منسوب ہیں۔قطب عالم رات کو تہجد کے لیے اٹھے تو ایک لکڑی سے ٹھوکر لگنے پر منہ سے یہ کلمہ نکلا''لوہا ہے کہ لکڑی ہے کہ پتھر ہے''۔قطب عالم کے فرزند شاہ عالم کے متعدد اقوال ہندی اور گجراتی میں ملتے ہیں۔ان سے ایک اور جملہ منسوب ہے کہ''تساں راجے۔اساں خواجے''یعنی تم بادشاہ اور ہم وزیر۔

حضرت سید محمد جونپوری (متوفی ۱۴۴۵ء) نے شیخ احمد کھٹو کی نسبت فرمایا:

''روپیٹنے خدا کوں پہنچے''

شیخ بہاء الدین باجن (۱۳۸۸ء۔۱۵۰۶ء) کی تصنیف ''خزانۂ رحمت'' میں ان کے ملفوظات، ارشادات، کلمات اوراقوال مشائخ سلف پر مشتمل ہے۔

شمس العشاق شاہ میراں جی (متوفی ۱۴۹۶ء) مکہ میں پیدا ہوئے اور بعد میں ہندوستان چلے آئے انھوں نے ہندوی میں سلوک ومعرفت پر متعدد رسالے تحریر کیے اور بہت سی نظمیں بھی لکھی ہیں۔خوش نامہ، شہادت الحقیقت، خوش نغز اور شرح مرغوب القلوب ان کی مشہور تصانیف ہیں۔نمونہ کلام یہ ہے:

توں قادر کر سب جگ سب کوں روزی دیوے
توں سبھوں کا دانا بینا سب جگ تجکوں سیوے

شیخ عبدالقدوس گنگوہی (۱۴۵۵ء۔۱۵۳۸ء) ہندوی کے شاعر تھے اور الکھ داس ان کا تخلص تھا۔تصوف اور وحدت وجود پر ان کی ایک کتاب ''رشد نامہ'' بہت مشہور ہے۔جس میں جگہ جگہ انھوں نے ہندوی دوہرے لکھے ہوئے ہیں۔

شاہ محمد غوث گولیاری (متوفی ۱۵۶۷ء)، شیخ وجیہہ الدین احمد علوی (متوفی ۱۵۸۹ء) اور شیخ بہاء الدین برنادی خاتم التارکین کا بھی ہندوی زبان میں کلام دستیاب ہے۔اس کے علاوہ شاہ برہان الدین جانم (متوفی ۱۵۸۲ء) نے ہندوی میں نظمیں، دوہے اور مثنویاں لکھی ہیں۔[۳] ان کا ایک شعر ہے

ہندی بولوں کیا بکھان
جے گُر پرساد تھا منج گیان

بھگت کبیر (۱۵۱۸ء) اور بابا گرونانک (۱۵۳۸ء) نے پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی میں روحانیت کا پیغام اور پرچار پنجاب کی سرزمین سے شروع کیا۔ان دونوں کی زبان میں عربی، فارسی اور کھڑی بولی کے اثرات نمایاں ہیں۔

تیموری شہزادے ظہیر الدین بابر نے ۱۵۲۶ء میں برصغیر میں مغل سلطنت کی بنیاد رکھی یہ مغل حکومت ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تک قائم رہی۔ہندوستان میں مغل حکمرانوں کا

دور ایک سنہرا دور ہے۔ مغل حکومت کے ساتھ ہی ہندوستانی ثقافت اور تہذیب وتمدن میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ علم وادب اور فنون لطیفہ اپنے کمال کو پہنچے۔ تعمیر کے اعلیٰ نمونے اور تراش خراش دیکھنے میں آئی۔ بابر کی مادری زبان ترکی تھی، حکومت کی زبان فارسی، اور دہلی کی زبان کھڑی بولی تھی اسی لیے اکبر نے کھڑی بولی میں اچھی طرح مہارت حاصل کر لی اس کا ایک شعر مشہور ہے:

مجکا نہ ہوا کج ہوس مانک و موتی
فقرا ہلیغہ بس بولغوسید ور پانی وروتی

(مجھ کو مانک وموتی لعل وگہر کی کوئی ہوس نہیں ہے فقیر کے لیے ایک ٹکڑا روٹی اور تھوڑا سا پانی کافی ہے۔)(۴)

شیخ جمالی (متوفی ۱۵۳۵ء) بابر کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں ان کے نام سے ایک ہندوی غزل منسوب ہے۔ بعض تذکروں میں یہ غزل امیر خسرو سے موسوم ہے۔ اس غزل کا ایک شعر دیکھئے:

ہر دو تیرا کتّا ہے
موتیا شد بر در توستا ہے

اس پر پنجابی اثر نمایاں ہے۔(۵)

شہنشاہ ہمایوں کے دربار میں کئی ایسے شعرا تھے جو ہندی میں بھی شعر کہتے تھے۔ ان میں سے شیخ گدائی کافی مشہور ہیں مگر ان کا کلام نہیں ملتا۔ ہمایوں کو اگر سکون اور اطمینان سے حکومت کرنے کا موقع ملتا تو وہ نہ معلوم زبان کی ترقی کے لیے کیا کچھ نہ کرتا۔ جس نے کامران مرزا کی ایک غزل کے صلہ میں حصار فیروز بخش دیا۔ ہمایوں خود بھی شاعر تھا اور ریاضی دان بھی تھا۔(۶)

کامران تا کہ جہاں راست بقا
خسروِ دھر ہمایوں بارا

مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر نے دارالحکومت دہلی سے آگرہ منتقل کر دیا۔ دہلی کے گردونواح میں کھڑی بولی رائج تھی جبکہ آگرہ میں برج بھاشا کا دور دورہ تھا۔ متھرا خالص ہندو مذہبی تحریکات کا مرکز ہونے کی وجہ سے برج بھاشا سنسکرت کے قریب تھی۔ جب متھرا کرشن بھگتی تحریک کا مرکز بنا تو ان دنوں برج بھاشا نے بہت ترقی کی۔ شمالی ہند میں اٹھارویں صدی عیسوی تک برج بھاشا کو واحد ادبی زبان ہونے کا شرف حاصل رہا۔ اکبر اور عبدالرحیم خان خاناں کے بارے میں مشہور ہے کہ انھوں نے برج بھاشا میں شعر کہے۔ صوبہ سرحد میں پیر روشاں (متوفی ۱۵۷۲ء) نے اپنی تصنیف خیرالبیان میں عربی، فارسی، پشتو اور اردو کے امتزاج سے دینی مطالب بیان کیے ہیں۔

گوسوامی وٹھل ناتھ اور ان کے صاحبزادے گوکل ناتھ نے اسی دور میں کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ان تصانیف کی زبان برج بھاشا ہے مگر اس پر کھڑی بولی کے اثرات نظر آتے ہیں۔ اسی زمانہ میں گنگ کوی (بھاٹ) نے کھڑی بولی میں ''چد چھند برنن کی مہیما''، لکھی جو ۱۵۷۲ء میں تصنیف ہوئی۔ اس کا ایک اقتباس یوں ہے۔

''اکبر ساہ جی (بادشاہ) عام کھاس (خاص) میں تکھت (تخت)
اوپر براجمان ہو رہے۔ اور عام کھاس بھرنے لگا ہے جس میں تمام امرا آئے
کورنش بجائے جہار کر کے اپنی اپنی بیٹھاک پر بیٹھ جایا کریں۔''

نوری اعظم پوری اور سعدی کاکوری کا تعلق بھی اکبر کے عہد سے ہے ان سے بھی کچھ ہندی شعر منسوب ہیں۔(۷)

مغل شہنشا جہانگیر ایک صاحب قلم شہنشاہ تھا جس نے تزکِ جہانگیری تالیف کی زبان کا شوق اور اس کی اصلاح و ترقی کا ذوق جہانگیر کے دور میں بھی جاری وساری رہا۔

مغل شہنشاہ شاہجہان نے دوبارہ آگرہ کی بجائے دلی کو دارالحکومت بنایا تو کھڑی بولی کے دن پھر گئے برج بھاشا بھی شاہی دربار کے ساتھ آگرہ سے دہلی آ گئی مگر زیادہ دن اپنی حیثیت برقرار نہ رکھ سکی۔ شاہجہان کے دور میں کھڑی بولی کو حیات نو ملی اسی لیے اردو کو شاہجہانی

اردو کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔نواب نصیر حسین خیال اردو کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''شاہجہان آباد بن چکا اور بادشاہ کے مبارک قدم ادھر آئے تو اردوئے معلیٰ کا شیر خوار بھی دامنِ دولت سے لپٹا ہوا ساتھ ساتھ آیا اس دن سے یہ طفل لال قلعہ میں اور شاہجہان کے سے سرپرست کی نظر کے سامنے پلنے اور بڑھنے لگا۔''(۸)

اورنگ زیب کے عہد میں کھڑی بولی نے مشترک ملکی زبان کی حیثیت اختیار کر لی اورنگ زیب موسیقی، رقص اور گیتوں کا مخالف تھا اس کی اس سنگیت دشمنی نے برج بھاشا کو بہت نقصان پہنچایا۔اورنگزیب نے جب دکن فتح کر لیا تو اس سے جہاں اور دوسری تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں وہاں اس سے یہ بھی ہوا کہ شمالی ہند اور جنوبی ہند کے درمیان رابطہ پیدا ہو گیا۔دونوں علاقوں کی زبان باہم شیر شکر ہو گئی۔مسلمان شعرا نے ہندی عروج پر اس زبان کو آزمایا اور بعد میں فارسی عروض کا پیراہن بھی پہنایا۔اس سلسلہ میں محمد افضل جھنجھانوی (متوفی ۱۶۲۵ء) کی بکٹ کہانی کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔جو ۳۲۵،اشعار پر مشتمل منظوم افسانہ ہے اور بارہ ماسہ کی روایت میں لکھا گیا ہے۔(۹) دو شعر درج ذیل ہیں:

پڑی ہے گل میں میرے پیم پھانسی
مرن اپنا ہے اور لوگوں کی ہانسی
مسافر سے جنھوں نے دل لگایا
انھوں نے سب جنم روتے گنوایا

اس دور میں ولی رام اور عہد عالمگیری کے مشہور مصنف سید برکت اللہ پیمی مارہروی نے چند ریختے بھی لکھے ہیں۔چندر بھان جو کہ شاہجہان کے دور کا شاعر تھا اس کا نمونہ کلام یہ ہے:

خوباں کے باغ میں رونق ہوئے تو کس طرح یاراں
نہ رونا ہے نہ مروا ہے نہ سوسن ہے نہ لالہ ہے

پیا کے نام عاشق کوں قتل یا عجب دیکھے ہوں
نہ برچھی ہے نہ کرچھی ہے نہ خنجر ہے نہ بھالا ہے

ناصر علی سرہندی (متوفی ۱۶۹۷ء) کی غزل میں بھی فارسی مضامین کی جھلک نظر آتی ہے۔شاہ مراد خان پوری (متوفی ۱۷۰۲ء) نے فارسی روایت میں پنجابی کی جھلک دکھائی ہے:

اگر عرفاں ہے تجھ کو، نہ بندہ ہو خدارا ہو
نہیں تاں پھر کے گلیوں میں گدائی کر کے کھاتا جا

جعفر زٹلی (متوفی ۱۷۱۳ء) نے ہجو اور مزاح میں کمال حاصل کیا۔فلک سیر مغل بادشاہ نے انھیں ہجو لکھنے کی پاداش میں قتل کرا دیا۔جعفر زٹلی نے مزاح کے ساتھ ساتھ سنجیدہ شاعری بھی کی ہے۔ان کے کلام میں غضب کی روانی پائی جاتی ہے۔نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور آیا ہے
ڈرے سب خلق ظالم سے عجب یہ دور آیا ہے
کہ یاروں میں رہی یاری، نہ بھائیوں میں وفاداری
محبت اٹھ گئی ساری عجب یہ دور آیا ہے

بیدل فارسی زبان کے شاعر تھے۔۱۷۲۱ء میں دہلی میں فوت ہوئے۔درویشی اور فقیری میں زندگی گزاری۔اردو میں شعر کہتے تھے۔نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے:

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں

شیخ محبوب عالم اور عبدالواسع ہانسوی، اورنگزیب عہد کے مشہور شاعر تھے انھوں نے نصاب زبان ''صمد باری'' تیار کی جو کہ خالق باری کی طرز پر تھی۔[10] ان کے شعر درج ذیل ہیں:

خواندن ، نوشتن ، فہمیدن جانو
پڑھنا ، لکھنا ، سمجھنا جانو
آوردن ، بردن ، سوختن کہیے

لانا ، لے جانا ، جلانا کہیے

تافتن ، بافتن ، درشتن کہو

گوندھنا ، کوٹنا ، روسنا کہو

دلشاد پسروری اٹھارویں صدی عیسوی کے مشہور شاعر تھے۔ جن کی شاعری پر ولی دکنی کی روایت کا اثر نظر آتا ہے۔

نے خط نہ کتابت نہ خبر نہ کچھ سندیسہ

پیغام ہمار گیا برباد نہ آیا

شاکر اٹکی (متوفی ۱۷۷۲ء) نے بھی فارسی شاعری سے استفادہ کیا ہے۔ شمالی ہند میں اردو نثر کا ارتقا محمد شاہ کے عہد میں (۱۷۳۲ء) فضلی نے ''دہ مجلس''، لکھی جس کو محمد حسین آزاد اردو نثر کی پہلی تصنیف قرار دیتا ہے۔[۱۱] اس میں دس مجلسوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔

دکن میں اردو زبان وادب

سیاسی اور سماجی پس منظر

ظہورِ اسلام سے پہلے بھی عرب لوگ بغرض تجارت دکن میں آتے تھے۔ بہت سے عرب لوگ یہیں رہائش پذیر ہو چکے تھے۔ دوسری اور تیسری صدی ہجری میں مسلمان تجارت کے ساتھ ساتھ تبلیغِ دین کا کام بھی کرنے لگے۔ تاریخ شاہد ہے کہ علاء الدین خلجی (۱۲۹۶ء۔ ۱۳۱۶ء) کے دور میں اسلامی فوجیں دکن میں پہنچ گئیں، خلجی جرنیل ملک کافور نے ساحلِ سمندر تک اسلامی پرچم لہرا دیا۔ ان فوجوں کے ساتھ دہلی میں بولی جانے والی فارسی زبان اور اسلوب سے متاثر کھڑی بولی بھی دکن پہنچ گئی۔ شمالی ہند اور دکن کے لوگوں کا آپس میں میل جول اور تعلقات کی وجہ سے ایک نئی زبان پرورش پانے لگی۔

محمد تغلق (۱۳۲۶ء) نے (دیوگری) دولت آباد کو پایۂ تخت بنا کر دہلی کی ساری رونقیں اور مجلسیں دولت آباد منتقل کر دیں۔ یہ پایۂ تخت صرف وقتی تھا لیکن جو لوگ دہلی سے آئے تھے وہ دکن ہی کے ہو کے رہ گئے۔ یہاں مختلف بولیوں کے امتزاج اور مقامی رنگ کی وجہ سے اردو کی وہ شکل ابھری جسے دکنی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اسی اثناء میں سیاسی صورتحال تبدیل ہو گئی اہلِ دکن نے تغلق حکومت ختم کر کے ۱۳۴۷ء میں آزاد بہمنی حکومت کی بنیاد رکھ دی جو

تقریباً دو سو برس تک جاری رہی۔

بہمنی سلطنت کا بانی حسن گنگو بہمن تھا، جو ایک غیر متعصب اور آزاد خیالات و نظریات کا مالک تھا۔ اس کی پرورش ایک ہندو نے کی تھی لہٰذا اس نے مالی و ملکی عہدوں پر برہمنوں تعینات کیا جس کی وجہ سے ملکی زبان دکنی ہوگئی اور دفتر کا کام مقامی زبان میں ہونے لگا۔ ان تمام چیزوں نے اردو کے فروغ کے لیے دکن کی فضا کو سازگار بنایا۔ بہمنی خاندان کے اکثر بادشاہ خود علمی و ادبی کمالات کے حامل تھے اور اہل علم و ادب کی سرپرستی بھی کیا کرتے تھے۔

بہمنی دور میں ادب کا آغاز

دکن میں اردو کی تصنیف و تالیف کا کام سب سے پہلے صوفیا کرام نے شروع کیا۔ شیخ عین الدین گنج العلم محمد تغلق کے دور میں دہلی سے دولت آباد آئے اور دکنی زبان میں چند رسائل تصنیف کیے۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (۱۳۲۱ء۔۱۴۲۲ء) دہلی سے گلبرگہ منتقل ہوگئے دکنی زبان میں آپ نے تین رسالے معراج العاشقین، ہدایت نامہ، سہ بارہ لکھے جو تصوف پر مبنی ہیں۔ گیسو دراز کے ایک مرید نے اپنے مرشد کے ملفوظات کی ''ہفت اسرار'' کے نام سے شرح لکھی۔ گیسو دراز کے پوتے سید عبداللہ حسینی نے حضرت غوث پاک کی کتاب ''نشاط العشق'' کا دکنی میں ترجمہ کیا اور شرح لکھی۔ شاہ میراں جی شمس العشاق (پیدائش ۱۲۹۶ء) بھی بڑے پہنچے ہوئے بزرگ تھے انھوں نے دکنی زبان میں نظم و نثر کی آبیاری کی۔ شاہ برہان الدین جانم (متوفی ۱۵۵۲ء) نے ''وصیت الہادی'' ''بشارت الذکر'' ''رمز الواصلین'' اور ''ارشاد نامہ'' تحریر کیا۔ انھوں نے روحانیت کے عام مسائل کو اپنی تحریروں کے ذریعے عوام تک پہنچانے کا کام کیا۔

قاضی محمود دریائی بیر پوری کا شمار گجرات کے اولیائے کرام میں ہوتا ہے انھوں نے ہندی زبان میں شعر کہے جس میں کہیں کہیں گجراتی، فارسی اور عربی لفظ بھی آتے ہیں۔[۱۲] ان کا نمونہ کلام یہ ہے:

پانچ وقت نماز گزاروں دائم پڑوں قرآن
کھاؤ حلال بولو مکھ ساچا راکھو درست ایمان

شاہ علی محمد جیو گام دھنی کا مولد ومنشا گجرات ہے آپ کا سنہ انتقال ۱۵۶۵ء ہے۔ آپ کے کلام کا مجموعہ ''جواہر اسرار اللہ'' کے نام سے ہے۔ طرزِ کلام ہندی شعرا کا سا ہے۔

میاں خوب محمد چشتی (۱۶۱۴ء) نے رشد و ہدایت اور نظم ونثر کے لیے اردو زبان کو وسیلۂ اظہار بنایا ان کی سب سے مشہور تصنیف ''خوب ترنگ'' ہے جس کا سنہ تصنیف ۱۵۷۸ء ہے۔

بابا شاہ حسینی صاحبِ دیوان شاعر ہیں ان کا کلام صوفیانہ اور عارفانہ ہے نمونۂ کلام اس شعر سے ملاحظہ کیجئے:

حق رسی کی ہے عبادت عین دید
جوں صنم کا مبتلا مست شراب

فخر الدین نظامی دکنی، احمد شاہ ولی البہمنی کے زمانہ سے تعلق رکھتے تھے ان کی زبان میں فارسی، سرائیکی اور پنجابی کے نقوش ملتے ہیں۔ ان کی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' بہت مشہور ہوئی۔ اس مثنوی کو اردو زبان کی پہلی باقاعدہ تصنیف کہا جا سکتا ہے۔[۱۳]

نظامی کے بعد اشرف بیابانی (متوفی ۱۵۷۲ء) کی مثنوی ''نوسرہار'' کو اس کے اسلوب اور تاثیر کی وجہ سے مقبولیت ملی انھوں نے ''نوسرہار'' میں ملتان کی علاقائی بولی سرائیکی کی مٹھاس بھر دی ہے۔[۱۴] حضرت زینبؓ کے حوالے سے شعر ملاحظہ کیجئے

زینب آ ہے اس کا نام
تو جا گذران اس پیغام
ہور کچھ تشریف اپنے سات
لے کر اس یوں کہہ بات

عبداللہ حسینی، سید شہباز، مشتاق اور لطفی وغیرہ نے غزل، مثنوی اور قصیدہ کی اصناف

میں طبع آزمائی کی۔

بہمنی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے کے بعد دکن میں پانچ آزاد ریاستیں قائم ہوگئیں۔ بیدر میں برید شاہی سلطنت، برار میں عماد شاہی سلطنت، احمد نگر میں نظام شاہی سلطنت، بیجاپور میں عادل شاہی سلطنت (۱۴۸۹ء تا ۱۶۸۶ء) اور گولکنڈہ میں قطب شاہی سلطنت (۱۵۱۸ء تا ۱۶۸۷ء) کا آغاز ہوا۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کو علمی مراکز کی حیثیت حاصل ہوتے ہی اہلِ علم و دانش اور شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والے جنوب کی طرف کھنچے چلے آنے لگے۔ ان سلطنتوں میں اردو زبان کو شاہی سرپرستی حاصل تھی۔ شاہی دربار اور دفاتر میں بھی اردو نے اہم مقام حاصل کرلیا تھا۔

اردو ادب عادل شاہی سلطنت میں
(۱۴۸۹ء تا ۱۶۸۶ء)

دکن کی سرزمین پر عادل شاہی حکومت تقریباً دو سو برس تک قائم رہی۔ عادل شاہیوں نے اردو کی ترویج میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس خاندان کے کئی بادشاہ خود بھی قادرالکلام شاعر تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ادب اور اہل ادب کی خوب سرپرستی کی۔ ان میں خاص خاص نام درج ذیل ہیں:

ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۵۸۰ء تا ۱۶۲۶ء) شہنشاہ اکبر اور جہانگیر کا ہم عصر تھا۔ علم و ادب سے گہرا شغف رکھتا تھا اور موسیقی کے فن سے بھی آگاہ تھا۔ اس نے ''نورس'' کے نام سے فنِ موسیقی پر کتاب بھی لکھی ہے۔

علی عادل شاہ ثانی کے دور میں بہت سے شعرا نے مقبولیت حاصل کی۔ ملک الشعرا غواصی اس دور سے تعلق رکھتا تھا۔ اس دور کے نامور شعرا کرام میں بہت سے نام گنوائے جاسکتے ہیں۔

رستمی: کمال خان نام تھا اور رستمی تخلص۔ دارالانشا کی افسری پر مامور تھا اس نے ۱۶۴۹ء میں فارسی زبان کی مشہور مثنوی ''خاورنامہ'' کا اردو میں ترجمہ کیا۔

نصرتی: ملک الشعراء نصرتی قادرالکلام شاعر اور بلند پایہ تھا۔ پورا نام محمد نصرت اور نصرتی تخلص

تھا۔ اس کی مشہور تصنیف مثنوی ''علی نامہ'' ہے۔ جس میں علی عادل شاہ کی فتوحات کا ذکر ملتا ہے۔ دوسری تصنیف ''گلشن عشق'' ہے۔ تیسری تصنیف ''گلدستۂ عشق'' کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ عاشقانہ غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ (۱۵) نصرتی کا انتقال ۱۶۸۴ء میں ہوا۔

ملک خوشنود: محمد عادل شاہ کے دربار کا ملک الشعراء تھا۔ اس نے ''ہشت بہشت'' کے نام سے ایک مثنوی لکھی۔ دوسری مثنوی کا نام ''یوسف زلیخا'' ہے۔ دونوں مثنویاں امیر خسرو سے ماخوذ ہیں۔

امین: شیخ امین الدین اعلیٰ امین تخلص کرتے تھے۔ حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق کے پوتے اور اپنے دور کے ولی تھے۔ ''جواہر الاسلام'' کے نام سے آپ کا کلام مریدوں نے جمع کیا۔ آپ نے کچھ رسالے بھی تحریر کیے ہیں آپ کا انتقال ۱۶۷۵ء میں ہوا۔ آپ نے دوہرے اور غزلیں لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت برہان الدین شاہ کی مدح میں قصیدہ بھی لکھا ہے۔

سیوا: سیوا گلبرگہ کا رہنے والا تھا۔ لیکن بعد میں بیجا پور میں رہنے لگا۔ سیوا نے ملا حسین واعظ کاشفی کی تصنیف ''روضۃ الشہداء'' کا منظوم ترجمہ کیا۔ ''قانون اسلام'' کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی۔ اس کے علاوہ کچھ مرثیے بھی تحریر کیے ہیں۔

ہاشمی: ہاشمی کا تعلق علی عادل شاہ کے عہد سے تھا۔ ان کا نام سید میراں تھا۔ سید شاہ ہاشم علوی کے مریدین میں شامل تھے۔ ۱۶۸۷ء میں اپنے مرشد کی فرمائش پر ''یوسف زلیخا'' کو منظوم کیا جس میں چھ ہزار سے زائد اشعار ہیں۔ یہ مثنوی دکنی ادب میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

عبدالمومن: انھوں نے ''اسرار عشق'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں حضرت جونپوری کی سوانح عمری اور کرامات کا ذکر کیا گیا ہے۔

مرزا محمد مقیم: دکن کے مشہور شاعر تھے۔ نعت، منقبت اور مرثیے لکھتے تھے۔ کسی بادشاہ یا امیر کی

شان میں کبھی کوئی شعر نہیں لکھا۔ مثنوی ''فتح نامہ بکھیری'' لکھی۔ ۱۶۶۹ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

مقیمی: ابراہیم عادل شاہ کے دور سے تعلق تھا۔ مقیمی نے دو مثنویاں لکھی ہیں: ''چندر بدن مہیار'' اور ''سومہار کی کہانی'' ان میں سے اول الذکر مثنوی بہت مشہور ہوئی۔ مقیمی نے یہ مثنوی غواصی کی ''سیف الملوک و بدیع الجمال'' کے تتبع میں لکھی ہے۔

حسن شوقی: حسن شوقی اپنے دور کے مشہور غزل گو شعرا میں شامل تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان کی غزلوں کا دیوان مرتب کیا ہے۔ انھیں مثنوی ''فتح نامہ نظام شاہ'' سے بہت شہرت ملی۔[۱۶] دوسری مثنوی ''میزبانی نامہ عادل شاہ'' ہے اس مثنوی میں اس دور کے رسم ورواج، عادات واطوار، ادب وآداب، اشیائے استعمال، ظروف وآرائش کی چیزیں، ناچ رنگ، رقص وسرور، شادی کی تقریبات، شوخی وشرارت، برات، جہیز اور آج سے صدیوں پہلے کی معاشرت اور تہذیب وتمدن کے نقوش ملتے ہیں۔[۱۷] حسن شوقی ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ لفظوں کو برتنا خوب جانتے تھے۔ نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے:

کھب کھب رہی ہے من میں تری زلف کی کھب کھب
مج جیو کے گلے میں پڑیا ہے طوق غب غب
سروے قداں سوں ہاوے شوقی ہوا ہے مجنوں
کب کب کیا ہوں توبہ کب کب کیا ہوں کب کب

۱۶۸۵ء میں اورنگزیب عالمگیر نے دکن فتح کرنے کے بعد بیجاپور کی ریاست مغل سلطنت میں شامل کر لی اور یوں عادل شاہی حکومت اختتام کو پہنچی۔ اس دور کی سب سے مقبول صنف ادب مثنوی تھی۔ جس میں تاریخ اور داستان کو خوبصورت انداز میں پیش کیا جاتا تھا۔ صنعتی، دولت، شاہ ملک، ایاغی، شغلی، علی، مرتضیٰ، حسین، قدرتی اور معظم ایسے شاعر اور اہل ادب نے بیجاپور میں زبان وادب کے لیے کام کیا۔

اردو ادب قطب شاہی سلطنت میں

(۱۵۱۸ء تا ۱۶۸۷ء)

بہمنی حکومت کے زوال کے بعد گولکنڈہ کی ریاست میں قطب شاہی خاندان کی حکومت شروع ہوئی۔ قطب شاہی حکمرانوں کا دور اردو کی ترقی کا ایک شاندار باب ہے۔ اس خاندان نے گولکنڈہ میں علم وادب اور اہلِ ادب کی سرپرستی کی۔ بڑے بڑے نامور شاعر اور اہلِ فن قطب شاہی دربار سے منسلک نظر آتے ہیں۔ تین قطب شاہی بادشاہ محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ تو خاص طور پر اردو ادب کی تاریخ میں ایک سنہرے دور کی حیثیت رکھتے ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ (متوفی ۱۶۱۱ء)

سلطان ابراہیم قلی قطب شاہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا محمد قلی قطب شاہ تخت نشین ہوا۔ محمد قلی قطب شاہ کو شعر وادب، خوشنویسی، فنِ تعمیر اور فنونِ لطیفہ سے بے حد لگاؤ تھا۔ وہ خود بھی اعلیٰ پائے کا شاعر تھا۔ اس کی کلیات میں فارسی، دکنی کے تقریباً پچاس ہزار اشعار موجود ہیں۔ اس نے مثنویاں، قصیدے، مرثیے، غزلیں اور رباعیاں لکھی ہیں۔ اس کے فن میں پختگی اور سلاست پائی جاتی ہے۔ محمد قلی قطب شاہ نے عشق ومحبت کے ساتھ ساتھ انسانی معاشرت،

مظاہرِ قدرت، شادی بیاہ کی رسوم، سال گرہ کی تقریب، شبِ برات، میلا دالنبی، عید، ہولی اور بسنت پر بھی شاعری کی ہے۔

حیدرآباد کا شہر محمد قلی قطب شاہ نے آباد کیا۔ محمد قلی قطب شاہ کی کلیات اس کے بھتیجے محمد قطب شاہ نے مرتب کی۔[18] محمد قلی قطب شاہ کا ایک شعر ملاحظہ کیجئے:

مکھ تیرا دیکھ کر میں ہوا آج مست

تیرے مکھ کے تئیں میں ہوا بت پرست

محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں تشبیہات واستعارات بڑے خوبصورت انداز میں استعمال ہوئے ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں ہندی اور فارسی دونوں زبانوں سے استفادہ کرتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ نے تقلید کو چھوڑ کر اردو شاعری میں ایک نئے لہجے اور نئے آہنگ کو راہ دی ہے۔

محمد قطب شاہ (متوفی ۱۶۲۵ء)

محمد قطب شاہ بھی علم دوست اور ادب پرور تھا۔ شعروسخن کا اچھا مذاق رکھتا تھا۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کرتا تھا۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ قلی قطب شاہ کے دیوان کی تدوین اور اس پر منظوم دیباچہ ہے۔ شاہی کتب خانہ کی بہت سی کتابوں پر محمد قطب شاہ نے دیباچے اور تنقیدی نوٹ تحریر کیے ہیں۔ جس سے اس کی تنقیدی صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے۔

عبداللہ قطب شاہ (۱۶۷۴ء)

اپنے پیش رو بادشاہوں کی طرح علم وادب سے گہرا لگاؤ رکھتا تھا۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں اس کے دیوان موجود ہیں۔ اس کو فنِ تعمیر کا بھی بہت شوق تھا۔ اس کا دربار فارس اور عرب کے اہلِ علم ودانش لوگوں سے بھرا رہتا تھا۔

ملا وجہی

پورا نام اسد اللہ اور وجہی تخلص تھا۔ قطب شاہی دور کا باکمال شاعروادیب تھا۔ ملا وجہی نے کئی بادشاہوں کا زمانہ دیکھا ہے وجہی نے اپنی مشہور مثنوی ''قطب مشتری'' ۱۶۰۹ء

میں تصنیف کی۔ مثنوی میں تقریباً ۲ ہزار اشعار موجود ہیں۔ جن میں بادشاہ قطب کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔۔ وجہی کی ایک اور مشہور و مقبول تصنیف ''سب رس'' ہے۔ سب رس میں ملا وجہی نے تصوف کے مسائل بیان کیے ہیں۔ سب رس کی عبارت مقفٰی و مسجع ہے اردو نثر کی تاریخ میں ''سب رس'' کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ سب رس ۱۶۳۴ء میں سلطان عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر لکھی گئی۔ قطب مشتری طبع زاد مثنوی ہے جو کہ خوبصورت پیرائے میں لکھی گئی ہے۔ چند اشعار درج ذیل ہیں:[19]

شفق صبح کا نہیں ہے آسمان میں
کہ لالے کھلے ہیں سنبلستان میں
خدا عاشقان کے لکھیا بھاگ میں
کہ جلنا اَچھے عشق کی آگ میں
یوں ایسا درد نہیں جو ہووے ہر کسے
بڑے بخت اس کے خدا دے جسے

دکنی دور کے شعرا خاص طور پر وجہی نے ہندی گیت کی روایت کے طور پر عورت کے جذبات کی عکاسی کی ہے۔[20] وجہی نے غزلیں، رباعیاں اور مرثیے بھی لکھے ہیں۔ ملا وجہی قلی قطب شاہ کے دربار میں ملک الشعرا تھا۔

غواصی

غواصی سلطان عبداللہ قطب شاہ کا ہم عصر تھا۔ غواصی کی دو مثنویاں بہت مشہور ہیں ''فسانۂ سیف الملوک و بدیع الجمال''، جس کا سنہ تصنیف ۱۰۳۵ء ہے دوسری ''طوطی نامہ'' جو کہ ضیاء بخش کے فارسی ''طوطی نامہ'' کا اردو ترجمہ ہے۔ دکنی دور کی شاعری سراپا نگاری سے بھرپور ہے۔ دکنی غزل پر ہندی گیت کی چھاپ نظر آتی ہے۔ غواصی نے غزل کی کیفیت کو نظم کی شکل میں پیش کیا ہے۔ غواصی نے غزلیں، قصیدے اور مرثیے بھی لکھے ہیں۔ اس کی شاعری کا نمونہ یہ ہے:

عشق کی آگ میں جل کر راک ہونا
عشق بازی میں چاک چاک ہونا
زمانے آج کی مجنوں ہوا پیدا
ہوا مشہور غواصی دکن میں

ابنِ نشاطی

ابن نشاطی کا تعلق بھی عبداللہ قطب شاہ کے دربار سے تھا۔ اس نے فارسی کتاب ''بساتین'' کا منظوم ترجمہ ''پھول بن'' کے نام سے ۱۶۵۵ء میں کیا ہے۔ ابن نشاطی نے یہ قصہ فنکارانہ اور تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اس طرح تحریر کیا ہے کہ یہ اس کی وجہِ شہرت بن گیا ہے۔ اس مثنوی میں سترہ سو اشعار ہیں۔ مثنوی کی زبان اور اندازِ بیان نہایت سادہ ہے۔

ملا قطبی

قطب شاہی دور کے شاعر تھے۔ انھوں نے ۱۶۳۷ء میں مشہور صوفی یوسف دہلوی کی کتاب ''تحفتہ النصاح'' کا دکنی زبان میں ترجمہ کیا۔

تحسین الدین

قادر الکلام شاعر تھا۔ اس کی مثنوی ''کاروپ کلا'' کے سب کردار ہندو ہیں اور کہانی کا ماحول بھی ہندوانہ ہے جسے مصنف نے کمالِ مہارت سے پیش کیا ہے۔

تانا شاہ

علم وادب اور عالموں کا قدردان تھا۔ اس کی غزل میں نیا اسلوب اور تخیل میں بلند پروازی کی علامات دیکھنے میں آتی ہیں۔

دکنی اردو، مغلوں کے عہد میں

اورنگزیب عالمگیر نے ۱۶۸۶ء میں عادل شاہی اور ۱۶۷۸ء میں قطب شاہی حکومتیں ختم کر کے دکن کا سارا علاقہ مغل سلطنت میں شامل کرلیا۔ حکومت بدل جانے کے بعد بھی اردو شعروادب کی محفلوں میں رونق اسی طرح قائم رہی جیسے پہلے تھی۔ فتح گجرات کے بعد شمال اور دکن میں فاصلے ختم ہو گئے۔ دونوں جگہوں کی زبانیں آپس میں مل گئیں۔ زبانیں چونکہ مزاجاً دو نہیں تھیں اس لیے ایک ہو گئیں۔[۲۱] مغل عہد میں جن دکنی شعرا نے امتیاز حاصل کیا ان کے نام اور تصانیف درج ذیل ہیں۔

عاجز

نام محمد علی اور عاجز تخلص تھا۔ قصہ فیروز شاہ، قصہ لعل و گہر، قصہ ملکہ مصر اس کی مشہور تصانیف ہیں۔

حسین ذوقی

بحر العرفان کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ حسن شوقی کے صاحبزادے تھے۔ ان کی دو مثنویاں ''وصال العاشقین'' ۱۶۹۷ء ''نزہت العاشقین'' ۱۶۹۹ء اور بہت سی غزلیں

دستیاب ہیں۔ اول الذکر مثنوی میں ذوقی نے ملا وجہی کی سب رس کو موضوع بنایا ہے اور مثنوی آخر الذکر میں اورنگزیب عالمگیر کی مدح میں بھی اشعار لکھے ہیں:

جو ہے اس وقت اورنگزیب عالی
نبی کے شرع کے گلشن کے والی
عبادت کے ہنر دوڑا کے بالذات
رکھا رازے ہیں دینداراں کے پھل پات

نزہت العاشقین میں ذوقی نے منصور حلاج کے قصہ کو منظوم کیا ہے۔ ذوقی نے غزلیں بھی لکھی ہیں۔

قاضی محمود بحری (متوفی ۱۷۱۷ء)

اردو دیوان کے علاوہ مثنوی ''من لگن'' (۱۷۰۰ء) اور ''بنگاب نامہ'' ان کی یادگار ہے۔ ان دونوں مثنویوں کا موضوع تصوف ہے۔ بحری کی غزلوں میں ایک گہرا تاثر موجود ہے۔ ان کے تصور عشق میں حقیقی اور مجازی عشق کا حسین امتزاج ملتا ہے۔[۲۲]

محمد فیاض ولی

ان کا وطن ویلور تھا ان کی مشہور مثنوی ''قصہ رن پدم اور روضۃ الشہدا'' ہے جس میں ولی نے کربلا کے واقعات کو منظوم کیا ہے۔

وجدی

شیخ وجیہہ الدین نام ہے۔ اپنے دور کے مشہور شاعر ہیں تصوف سے گہرا شغف رکھتے ہیں، ان کی مثنوی کا نام ''باغ جانفزا'' ہے۔ انھوں نے شیخ فریدالدین عطار کی مثنویوں ''منطق الطیر'' اور ''گل وہرمز'' کا ترجمہ ''پنچھی باچھا'' اور ''تحفہ عاشقان'' کے نام سے ۱۷۱۰ء میں کیا۔

ولی

ولی کے آباؤ اجداد کا تعلق گجرات سے تھا۔ وہ ہجرت کر کے دکن آ گیا تھا۔ اس کا نام

ولی محمد تھا۔ بعض محقق ان کا نام محمد ولی اور ولی اللہ بتاتے ہیں۔ ان کی پیدائش میں بھی اختلاف ہے۔[۲۳]

غزل کو نیا اسلوب اور نیا آہنگ دینے میں ولی کا ہاتھ ہے۔ اردو غزل کے ارتقا میں ولی کے اثرات نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ ولی نے غزل قصیدہ، مثنوی، مستزاد، رباعیات، ترجیع بند تقریباً تمام اصناف میں شاعری کی ہے۔ ان کے کلام میں رومانویت کا پرتو پایا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں دکنی الفاظ وتراکیب خوبصورت اور شیریں وشستہ انداز میں ملتی ہیں جن میں لذت اور مٹھاس کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ان کا پسندیدہ موضوع حسن محبوب یا جمال ہے دیوان کا بیشتر حصہ اسی کے ذکر پر مشتمل ہے۔[۲۴]

ولی کے کلام میں دکنی، گجراتی، بھاشا اور فارسی زبانوں کے الفاظ ملتے ہیں۔ ولی نے دہلی کے دو سفر کیے۔ جس کی وجہ سے ان کے کلام میں دکنی اثرات کے ساتھ ساتھ دہلی اندازِ بیان بھی پایا جاتا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ کیجئے:

آہ پر آہ کھینچتا تھا میں
آج کی رات کچھ حساب نہ تھا
مسند گل منزل شبنم ہوئی
دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا
شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی و کیا مجازی کا

ولی جب محبوب کا ذکر کرتا ہے تو الفاظ سے موسیقی کی لے پھوٹنے لگتی ہے اور دل جھوم جھوم اٹھتا ہے۔ ولی کا مزاج مقامی ہے مگر اس نے فارسی اوزان اور الفاظ کے استعمال سے شاعری میں رومان پیدا کر دیا ہے۔ ولی کی وفات ۱۷۰۷ء (۱۱۱۹ھ) میں ہوئی۔[۲۵] ولی کے دور میں جن شاعروں نے شہرت پائی ان میں سراج، ہاشم علی، حامی، امین گجراتی، قادر اور اشرف کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

عہد بہمنی سے لے کر ولی کے عہد تک اردو زبان وادب کے جائزے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چار سو برس کے زمانہ میں اردو کی حیثیت شمالی ہند میں بولی سے آگے نہ بڑھ سکی۔ زبان میں کوئی خاطر خواہ اضافہ نہ ہوا اور دکن میں اردو زبان وادب نے بہت تیزی سے ارتقا کی منزلیں طے کیں جبکہ جنوبی ہند میں اردو زبان وادب کا ارتقا شمالی ہند کے بعد شروع ہوا۔ دکن میں بہت جلد اردو نے ادبی اور کلیدی حیثیت حاصل کر لی۔ دکنی ادب کو ہم اردو کی ابتدائی شکل کہہ سکتے ہیں۔ صدیوں کے تغیرات نے اردو زبان میں بڑی تبدیلی پیدا کی ہے۔ دکنی ادب میں دکن کی مقامی بولیوں کے گہرے اثرات دیکھنے میں آتے ہیں۔ جبکہ شمالی ہند میں اردو کی شان وشوکت فارسی کی آرائشوں اور زیبائشوں کی وجہ سے قائم ہوئی۔ دکن کو یہ فخر حاصل ہے کہ اردو زبان وادب نے سب سے پہلے اس کی سرزمین پر نشو ونما پائی اور تقریباً دو سو برس صرف دکن نے اردو زبان وادب کی آبیاری کی۔

دکن میں ادب کا آغاز تصوف کے رسالوں اور بزرگوں کے کلام سے ہوا۔ لیکن بعد میں تمام اصناف شاعری مثنوی، غزل، مرثیہ، قصیدہ، ترجیع بند، رباعی اور نظم میں شعرا کرام نے طبع آزمائی کی ہے اور فکر وخیال کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ دکن میں بہت سے ایسے شاعر گزرے ہیں جو بیک وقت کئی اصناف سخن میں مہارت رکھتے تھے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلیات میں ہر صنف کی شاعری کے نمونے ملتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ شوکت سبزواری، داستان زبان اردو، ص ۲۰۹
۲۔ شمس اللہ قادری، اردوئے قدیم، جنرل پبلشنگ ہاؤس کراچی، ۱۹۶۲ء، ص ۳۹
۳۔ عبدالحق مولوی، اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیا کرام کا کام، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، ۱۹۷۷ء، بار چہارم، ص ۶۳
۴۔ نصیر حسین خیال، داستان اردو، ص ۴۸
۵۔ شوکت سبزواری، داستان زبان اردو، ص ۲۰۷
۶۔ نصیر حسین خیال، داستان اردو، حواشی ص ۴۹
۷۔ شوکت سبزواری، داستان زبان اردو، ص ۲۱۰۔۲۰۷
۸۔ نصیر حسین خیال، داستان اردو، ص ۵۶
۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، ص ۶۸
۱۰۔ حسن اختر ملک، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، ص ۲۴
۱۱۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر (مرتب)، آب حیات از محمد حسین آزاد
۱۲۔ عبدالحق مولوی، اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۰۷
۱۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر (مرتب)، مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، ۱۹۷۳ء، ص ۳۰
۱۴۔ افسر صدیقی (مرتب)، مثنوی نوسر ہار از اشرف بیابانی، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، ۱۹۸۲ء، ص ۴
۱۵۔ محمد عسکری مرزا (مترجم)، تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ، غضنفر اکیڈمی کراچی، س ن، ص ۲۷
۱۶۔ محی الدین قادری زور، دکنی ادب کی تاریخ، اردو اکادمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۹ء، ص ۴۲
۱۷۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر (مرتب)، دیوان حسن شوقی، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، ۱۹۷۱ء، ص ۲۷۔۱۵۲
۱۸۔ حسن اختر ملک، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، ص ۵۱
۱۹۔ عبدالحق مولوی (مرتب)، قطب مشتری از ملا وجہی، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۵۳ء، ص ۳۸
۲۰۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو شاعری کا مزاج، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۲۳۷
۲۱۔ نصیر حسین خیال، داستان اردو، ص ۶۷
۲۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو جلد اول، ص ۵۲۲
۲۳۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، ولی پر مذاکرہ، اوراق لاہور، شمارہ نمبر ۳، ۱۹۶۷ء، ص ۹
۲۴۔ عرفان اشرف، ولی کا لسانی اور فنی شعور، دیوان ولی (انتخاب)، میری لائبریری لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۲۷
۲۵۔ عبدالحق، ولی کی سنہ وفات کی تحقیق مشمولہ تلخیص اردو از سید ہاشمی فرید آبادی (مرتب)، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، ۱۹۵۳ء، ص ۴۰۷

اردو رسم الخط: تاریخی و لسانی پس منظر

تحریروں کے علامتی نظام کو رسم الخط کہا جاتا ہے۔ رسم الخط میں مختلف علامات جنھیں ہم حرف کہتے ہیں زبان کی مختلف اکائیوں کی ترجمانی کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔ رسم الخط میں علامتیں صوتی اکائیوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔

رسم الخط ایسی تحریری علامات کو کہتے ہیں جن کو جب زبان سے ادا کیا جاتا ہے تو وہ اظہار و بیان کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسان شروع میں اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے لیے اور اپنا مدعا بیان کرنے کی خاطر اشاروں اور مختلف نقوش سے مدد لیتا تھا۔ رفتہ رفتہ ان اشاروں اور نقوش نے باقاعدہ شکل اختیار کر لی اور یہ باقاعدہ شکل حرفوں اور لفظوں میں زبان کے رسم الخط کے طور پر متشکل ہو کر بتدریج موجودہ شکل تک پہنچی ہے۔ بقول ڈاکٹر سہیل بخاری:

> ''رسم الخط آوازوں کو محفوظ رکھنے کا ایک ذریعہ ہے اور اسے محض ذریعہ سمجھنا چاہیے۔ ہمارا مقصود اصلی آواز ہے، حرف نہیں اس لیے نگاہوں کو حرف پر نہیں رک جانا چاہیے بلکہ اس میں جو آواز ملفوف ہے اس تک پہنچنے کی کوشش کرنا چاہیے یعنی آواز کو حرف پر اور زبان کو رسم الخط پر مقدم رکھنا چاہیے۔''[1]

اظہار و ابلاغ کا فریضہ سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ زبان نے ثقافتی ترقی اور اجتماعی معاشرے کے ارتقا میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ جیسے جیسے انسانی ذہن استوار ہوتا گیا زبان کے لیے تحریری علامتیں بھی وجود میں آنے لگیں۔ یہ تحریری علامتیں عرصہ دراز کے بعد رسم الخط کی صورت اختیار کرتی چلی گئیں۔ بقول شیر محمود اختر:

''رسم الخط تحریری علامتوں کا ایک باقاعدہ نظام اور سلسلہ ہوتا ہے اس نظام اور سلسلے میں ہر علامت زبان کی ایک اکائی کی مظہر بنتی ہے اور اس کی نمائندگی کرتی ہے۔''(۲)

خیال کیا جاتا ہے کہ شروع میں انسان دوسرے انسانوں کو اشیاء کی تصویر بنا کر اپنا مدعا بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوگا۔ مثال کے طور پر پرندوں، درندوں، پہاڑ، دریا، سمندر، گھر، درخت، مرد عورت، بچہ، بوڑھا کے بارے میں بات کرنا مقصود ہوتا تو شاید ان کی تصویر بنا کر دوسروں تک اپنی بات پہنچاتا ہوگا۔ اس کی ابتدائی شکل مصری رسم الخط میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے، رفتہ رفتہ تصویر کی جگہ مختلف مختصر علامات کا استعمال ہونے لگا ہوگا۔ بقول پروفیسر صادق حسین طارق

''یمن اور جنوبی عرب میں علامات کی بجائے مختلف خیالات، الفاظ اور آوازوں کے لیے فرضی علامتیں بنائی جانے لگیں۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہیں سب سے پہلے رسم الخط کی ابتدا ہوئی۔ اس وقت اس کی یہ شکل ہوتی تھی کہ علامتوں اور تصویروں کی درمیانی منزل کو حروف کی صورت میں اپنایا گیا ہو۔''(۳)

شروع میں اشیاء کے ذریعے سے خیالات کا اظہار کیا جاتا تھا جیسے تنکے سے مراد بیمار یا دبلا ہونا، سرخ پھول سے محبوب یا خوبصورت عورت۔ رنگوں کی مدد سے مختلف خیالات و کیفیات کا بیان۔ دھاگے یا تسلیوں میں گرہیں اور لکڑی پر دندانے بنا کر دنوں کو یاد رکھنا اور حساب کتاب کرنا۔ تصویریں اور نقوش بنانا۔ نشانات کی مدد سے اظہار کرنا۔ تصویری رسم الخط کے ذریعے اپنے مدعا کی ترسیل کرنا۔ تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ بہت رسوم الخط

مختلف ادوار میں مختلف علاقوں میں اپنائے گئے۔ محمد اسحٰق صدیقی نے ان کی درج ذیل تفصیل بیان کی ہے:

سمیری رسم خط

عراق کی سمیری قوم ۳۵۰۰ ق م تا ۲۰۰۰ء ق م۔ ان کا رسم الخط تصویری تھا۔ اس رسم الخط میں دو ہزار نقوش و تصاویر سے کام لیا جاتا تھا۔

میخی رسم خط

یہ رسم الخط ایران کی مغربی سرحد سے لے کر ایشیائے کوچک تک مستعمل تھا۔ مصر میں بھی اس رسم الخط میں کام ہوتا رہا۔ اس رسم الخط کے نشانات کھونٹی (میخ) سے مماثلت رکھتے تھے اسی لیے اس کو میخی، پیکانی اور مسماری کا نام دیا گیا۔ یہ رسم الخط سن عیسوی کے آغاز تک جاری رہا۔

اکادی رسم خط

سامی قوم نے عراق میں ۳۰۰ ق م یہ رسم الخط اختیار کیا۔

بابلی رسم خط

حکومت بابل کے پہلے بادشاہ حمورابی ۱۹۰۰ء کے عہد میں اکادقوم وزبان کے لیے لفظ اکاد سے تبدیل کر کے بابل کر دیا گیا۔ یہ اکاد رسم الخط سے مختلف نہ تھا۔ انھوں نے میخوں میں کچھ تبدیلی کر دی تھی۔ یہ رسم الخط بائیں سے دائیں پڑھا جاتا تھا۔

ان رسوم الخط کے علاوہ دیگر کے نام درج ذیل ہیں:

آشوری رسم خط، قدیم فارسی رسم خط، ایلم کا پرانا رسم خط، ایلم کا نیا رسم خط، وادیٔ سندھ کا رسم خط، حتی رسم خط، کریٹ کی لکھائی، قبرص کا رسم خط، چینی کا رسم خط، جاپانی کا رسم خط، جزیرہ ایسٹر کا رسم خط، مایا قوم کا رسم خط، ازتیق قوم کا رسم خط، سامی رسم خط، فیقی رسم خط، آئبیری رسم خط، ابتدائی عبرانی کا رسم خط، آرامی رسم خط، عبرانی رسم خط، تدری رسم خط،

نبطی (Nabateen) رسم خط، سینیا کا نیا رسم خط، عربی رسم خط، کوفی رسم خط، سریانی رسم خط، ایرانی رسم خط، آویستی رسم خط، مندائی رسم خط، کھروشٹی رسم خط، آرمینی رسم خط، گرجی رسم خط، سوغدی رسم خط، یوئگر یا یوگوری رسم خط، منگولی، رسم خط، قلقامی رسم خط وغیرہ۔(۴)

عربی، سائرلک، چینی، بنگالی، عبرانی، کنیڈین اے بی، دیوناگری، گیز (Geez)، لاطینی وغیرہ وہ رسم الخط ہیں جو ایک سے زیادہ زبانوں میں رائج ہیں۔ سب سے قدیم رسم الخط کے بارے میں ابن وصی لکھتے ہیں:

> ''آثارِ قدیمہ اور لسانیات کے ماہرین کے مطابق وہ پہلی زبان جس نے اولین ابجدی حروف وضع کیے پروٹو سیمیٹک (Proto-Semitic) ہے۔ اسے آثار قدیمہ کے اکثر ماہرین پروٹو سینائی (Proto-Scinaitic) اور پروٹو کنعانی (ProtoCanaaite) زبان بھی کہتے ہیں۔ یہ حقیقتاً تمام ابجد زبانوں کی ماں ہے یعنی آج ہم جو بھی حروف پڑھتے ہیں چاہے وہ ا ب پ ت ٹ ث ہوں یا ABCD یا ایفا گیما، بیٹا، ڈیلٹا وغیرہ یہ تمام حروف اسی زبان سے اخذ کیے گئے ہیں۔۔۔ پروٹو سیمیٹک زبان میں حروف تہجی کی تعداد ۲۲ ہوتی تھی یعنی اب ت ج ح د ر ز س ص ط ع ف ق ک ل م ن وہ ی۔۔۔ یہ زبان اردو کی طرح دائیں سے بائیں لکھی جاتی تھی۔۔۔ یہ زبان سامی النسل اقوام کی اولین زبان تھی۔ یہ زبان آج سے چھ سے آٹھ ہزار سال قبل مغربی ایشیا میں رائج تھی۔''(۵)

موہنجودڑو اور ہڑپہ کی تہذیب کے حوالے سے تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی تہذیب ہے جو سومیریوں اور بابلیوں کی ہے۔ مسٹر ہنٹر فرماتے ہیں کہ موہن جودڑو اور ہڑپہ کی تحریر یا تو پتھروں پر نقش ملی ہے یا پیتل اور تانبے کی تختیوں پر، پکی ہوئی مٹی پر صرف مہریں چھاپی جاتی تھیں۔ اس وقت حروف ابجد ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ تحریر تصویری اور تشبیہی تھی جیسی کہ سومیریوں اور بابلیوں کے شروع عہد کی تھی۔ یوں یہ تحریر دائیں سے بائیں کو لکھی جاتی تھی۔ مصری تتبع نہ کیا جاتا تھا جو جانور کے سر سے شروع ہوتی ہے اور دم کی طرف چلتی ہے۔

اس کی عمر تین ہزار ق م سے کئی سو سال پہلے کی ہے۔ یہ قدیم سومیری رسم الخط سے مشابہ اور اس کا تشابہ ماقبل عیلدی رسم الخط سے ہے۔ جمدت نصر رسم الخط (۳۵۰۰ ق م) سے اس کا تشابہ ۳۰۰ اور ۲۰۰ ق م کے عراقی رسم الخط سے کہیں زیادہ ہے۔(۶)

جس طرح زبان کے بارے میں کوئی وثوق سے نہیں کہہ سکتا ہے کہ اس کی ابتدا کہاں، کیسے اور کیوں کر ہوئی ہوگی اسی طرح زبان کے رسم الخط کے آغاز کے بارے میں بھی ہم اندھیرے میں ہیں۔ دنیا میں پائی جانے والی مختلف زبانوں اور ان کے مختلف رسم الخط یہ ضرور بتاتے ہیں کہ ان کا آغاز مختلف ادوار اور مختلف علاقوں میں ہوا ہوگا۔ بقول ڈاکٹر سہیل بخاری رسم الخط مختلف آوازوں کی تحریری علامتوں یعنی حروف ہجا کا ایک نظام ہے انسان جب زبان کی بنیادی آوازیں ایجاد کر چکا تو اسے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کی آوازوں کے سمعی روپ کو بصری روپ میں تبدیل کر کے اس کے خیالات غیر حاضر شخص تک صحت اور قطعیت سے پہنچائے جا سکیں بلکہ مستقبل میں ضرورت پڑنے کے لیے محفوظ بھی کیے جا سکیں تا کہ جو بھی چاہے ان سے حسب ضرورت استفادہ کر سکے۔ اشوک کے عہد کی تحریریں آج بھی دستیاب ہیں جو کہ پتھر پر کھدی ہوئی ہیں۔ یہ تحریریں کھروشٹی اور برہمی نام کے رسوم الخط میں لکھی گئی ہیں۔(۷)

مہاراج اشوک کے زمانہ میں برہمن برہمی کو خروشتی پر بہت ترجیح دیتے تھے اور شاید ہی کوئی برہمن ایسا تھا جو خروشتی سے دلچسپی رکھتا ہو۔ مگر ڈیمی ٹریس اور مینانڈر کے عہد میں برہمنوں کو بادل نخواستہ خروشتی سے دلچسپی لینا پڑی اور چونکہ انڈو یونانی کوئی دو سو سال تک چلا، اس لیے خروشتی اور یونانی دونوں رسم الخط برہمی سے کافی حد تک قریب آ گئے بلکہ ڈاکٹر مکرجی کے بیان کے مطابق یونانی کے کئی حروف، کسی نہ کسی شکل میں برہمی میں داخل ہو گئے تھے بعض علماء نے برہمی کو یونانی کی چھوٹی بہن قرار دیا ہے۔ انڈو یونانی عہد ساکوں کے دور اقتدار یعنی ۱۳۶ بعد مسیح تک چلا۔(۸)

کچھ رسم الخط دائیں طرف سے بائیں طرف کو لکھے جاتے ہیں جیسے نسخ، کوفی، برہمی

وغیرہ۔ کچھ بائیں سے دائیں طرف کو لکھے جاتے ہیں جیسے رومن اور دیوناگری اور کچھ اوپر سے نیچے کی طرف لکھے جاتے ہیں ان میں چینی اور چین کے دوسرے کئی رسم الخط شامل ہیں۔ دنیا میں رومن رسم الخط سب سے زیادہ ہے اس کے بعد عربی، مراٹھی، سرلک (روسی) بنگالی اور جاپانی کا نمبر آتا ہے۔(۹)

اردو رسم الخط، عربی رسم الخط سے ماخوذ ہے، ظہور اسلام سے پہلے عرب میں مختلف رسم الخط رائج تھے۔ آنحضرت ﷺ کے دور میں جو رسم الخط سب سے زیادہ مقبول ہوا وہ کوفی رسم الخط تھا۔ کلام الٰہی بھی اسی رسم الخط میں لکھا گیا اور آنحضرت ﷺ نے اس دور میں مختلف ملکوں کے سربراہوں سے جو خط و کتابت کی وہ بھی کوفی رسم الخط میں کی۔ کوفی رسم الخط کی مقبولیت کی وجہ سے ہر مکتبہ فکر کے لوگوں نے اسے اپنی تحریروں کے لیے استعمال کیا۔ پروفیسر محمد سجاد مرزا لکھتے ہیں

''خط کوفی کی سادگی لوگوں کو بہت پسند آئی اس لیے سرکاری دفتروں میں، تجارتی کاروبار میں اور مدارس و مکاتیب میں وہ مقبول ہو گیا تقریباً تین سو سال تک یہ خط رائج رہا، اس اثنا میں خط کوفی نے کئی پلٹے کھائے۔''(۱۰)

خلیفہ مقتدر باللہ کے وزیر ابن مقلہ (۲۹۵ھ۔۳۲۰ھ) (۹۲۴ء) نے رسم الخط کے حوالے سے قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ اس نے جدت سے کام لیتے ہوئے چھ رسم الخط ایجاد کیے جن کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ خطِ محقق

۲۔ خطِ ریحان

۳۔ خطِ ثلث ریحانی

۴۔ خطِ نسخ

۵۔ خطِ رقاع

۶۔ خطِ توقیع

ان سب میں خط نسخ قرآن مجید لکھنے کے لیے مخصوص کیا گیا تھا مگر اپنی سادگی اور خوبصورتی کی وجہ سے عام طور پر لکھائی کے لیے یہی خط استعمال ہونے لگا اور اس نے باقی تمام رسم الخط منسوخ کر دیے۔ ابن مقلہ کے بعد ابن بواب (۴۱۲ھ/۱۰۲۱ء) اور یاقوت مستعصمی (۶۹۸ھ/۱۲۲۹ء) نے خطِ نسخ کو معراج کمال پر پہنچا دیا۔(۱۱)

چوتھی صدی عیسوی میں حسن بن حسین علی نے خط رقاع اور خط توقیع کی مدد سے فارسی زبان کے لیے ایک نیا رسم الخط اختراع کیا اس رسم الخط کا نام خطِ تعلیق رکھا گیا۔ یہ رسم الخط خاصا پیچیدہ تھا اور خط نسخ کی طرح اس میں سادگی نہیں تھی۔ آٹھویں صدی ہجری میں میر علی تبریزی نے امیر تیمور گورگانی کے عہد حکومت (۸۰۷ھ/۱۴۰۵ء) میں فارسی رسم الخط پر نئے سرے سے کام شروع کیا۔ انھوں نے اپنی متنوع طبیعت کی وجہ سے رسم الخط میں کچھ نئی تبدیلیاں پیدا کر کے اسے مزید خوبصورت بنانے کی کوشش میں خط نسخ اور خط تعلیق کے امتزاج سے ایک نیا خط ایجاد کیا جس کا نام خط نستعلیق ہے۔(۱۲)

خط نستعلیق اپنی خوبصورتی اور حسن کی وجہ سے مقبول ہوا۔ اس خط کی کششوں اور دائروں میں حسن وتناسب نے اسے خطاطی کی حدود سے نکال کر نقاشی کے ہم دوش کر دیا۔ رسم الخط میں مصوری کی نزاکت اور نقاشی کی خوبصورت کی وجہ سے تحریر حرفوں کی تصویر بن گئی۔(۱۳)

اردو رسم الخط دلآویز ہے جو ایجاد اور اختراع کے نئے نئے پہلوؤں سے مزین ہے۔ اس رسم الخط میں تخلیقی صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اس رسم الخط کو اس کے لکھنے والوں نے اپنی جدت طبع اور رنگینیٔ قلم سے مصوری کا درجہ عطا کر دیا ہے جس کی وجہ سے حسن کاری کے وہ نادر نمونے وجود میں آ چکے ہیں جنھیں ہم فخریہ طور پر بین الاقوامی آرٹ گیلریوں میں عالمی فن پاروں کے برابر نمائش کے لیے رکھ سکتے ہیں۔

زبان اور رسم الخط کی اہمیت اس حوالے سے دوچند ہو جاتی ہے کہ یہ دونوں قوموں کی تہذیبی اساس کو مضبوط بنیادیں فراہم کرنے کا سبب ہیں۔ خلیل صدیقی لکھتے ہیں:

''سماج اور تہذیب تغیر پذیر سہی زبان میں ان کا عکس ملتا ہے

زبان ان کی تشکیل وتزئین، فروغ وارتقا میں کچھ نہ کچھ کردار ضرور ادا کرتی ہے لسانی گروہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کی زبان اس کی تہذیب کی نمائندہ اور امین ہے۔،،(۱۴)

خط نسخ کے حوالے سے کچھ مشکلات کا سامنا تھا اس میں الفاظ کی نوک پلک بنانے اور سنوارنے میں بہت زیادہ وقت کی ضرورت ہوتی ہے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے مرتضٰی قلی خاں شاملو نے ۱۱۰۰ء میں خط نستعلیق میں جدت طبع سے کام لیتے ہوئے کچھ اضافے کیے اور ایک نئے خط کے خدوخال اجاگر کیے جسے خط شکستہ کا نام دیا۔ یہ خط نستعلیق کی مختصر صورت ہے یہ خط روزمرہ خط وکتابت اور تحریروں کے لیے استعمال ہونے لگا۔

اردو زبان مختلف زبانوں کا مجموعہ ہے اس میں عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت، پرتگالی، یونانی، ترکی اور انگریزی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔ ہندوستان میں جب اردو زبان ارتقا کے مراحل سے گزر رہی تھی تو اسے ناگری رسم الخط میں لکھا جاتا تھا۔ فارسی دان اسے فارسی رسم الخط میں لکھتے تھے اور جب انگریزوں نے برصغیر میں اپنے قدم جما لیے تو انھوں نے اس زبان کے لیے رومن رسم الخط کو ترجیح دی۔

اردو عوامی رابطے کی وجہ سے ایک زبان کی صورت میں متشکل ہوئی اس میں ہر بولی اور زبان کا تھوڑا بہت حصہ ہے۔ جس طرح اردو زبان مختلف مراحل سے گزر کر پروان چڑھی ہے۔ اسی طرح اس کا رسم الخط بھی آناً فاناً نہیں بن گیا۔ کسی بھی زبان کا رسم الخط اس زبان کی اصوات سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہوتا ہے جس کے لیے ایک طویل عرصہ درکار ہوتا ہے بالکل اسی طرح اردو زبان کے رسم الخط کا بھی ایک تاریخی پس منظر ہے۔ سید قدرت نقوی کے بقول:

''اردو رسم الخط اپنی ایک مبسوط تاریخ رکھتا ہے۔ جس کا سلسلہ مصری تصویری رسم الخط سے ملتا ہے۔ فنیقی، حمیری اور کوفی خط سے اس کا رشتہ ہے۔ خط کوفی کی مہذب شکل خط نسخ و نستعلیق۔۔۔ ذریعہ تحریر ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے ذوق مصوری اور جمالیاتی احساس کی تسکین کا باعث بھی ہے۔ ہماری مقدس عمارتوں کی تزئین کا سامان یہی رسم الخط ہے۔،،(۱۵)

وثوق سے یہ بات کہنا ممکن نہیں کہ ہندوستان میں اردو کے لیے عربی رسم الخط کا آغاز کب ہوا۔ اس حوالے سے مختلف لوگوں نے روایتوں اور اندازوں سے کام چلایا ہے۔

جب ہندوستان میں اردو کی داغ بیل پڑی تو ابتدا میں اسے ناگری رسم الخط میں لکھا جاتا تھا لیکن جب اس نے زبان کی حیثیت اختیار کر لی تو فارسی داں اس کو فارسی خط میں لکھنے لگے۔ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں سب سے پہلے ۳۶۷ھ میں میر باقر ذوالکمالین آئے جو میر علی ہروی (جنھیں نستعلیق کا استاد مانا جاتا تھا) کے والد تھے پھر ہمایوں کے زمانہ میں ۹۶۵ھ میں خواجہ سلطان علی تشریف لائے اور اس کے بعد شاہجہان کے زمانہ میں ۱۰۳۸ھ میں آقا عبدالرشید دیلمی آئے ان کے باعث ہر جگہ خط نستعلیق رائج ہو گیا۔ باہر سے آنے والوں کے علاوہ ہندوستان میں بے شمار خوشنویس پیدا ہوئے جن کی وصلیاں آج بھی موجود ہیں۔ یہاں کوئی نیا رسم الخط ایجاد نہ ہوا۔ عربی اور ایرانی رسومِ خط کی کامیاب نقل اتاری جاتی رہی۔ البتہ ط اور ڑ کے اضافے سے ہندی کی مخصوص آوازوں کو ظاہر کرنے کے لیے کچھ نئے حروف ضرور ایجاد ہوئے۔(۱۶)

زبان رسم الخط کے بغیر مکمل نہیں ہوتی بلکہ ادھوری رہتی ہے جس زبان کا اپنا رسم الخط نہ ہو تو اس کا دامن علم وادب کے خزانوں سے تہی رہ جاتا ہے جس طرح روح اور جسم ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں بالکل اسی طرح زبان اور رسم الخط کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ جامع اور مکمل رسم الخط زبان کو نئی تراش خراش عطا کر کے اسے زمانے کے تقاضوں اور اظہار و بیان کے رموز سے ہمکنار کرتا ہے۔ اردو زبان کے فروغ اور ترویج میں مسلمانوں کا بہت ہاتھ ہے۔ اردو زبان نے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں پرورش پائی اور ارتقا کی منازل طے کیں۔

مسلمانوں کی زبان فارسی اور عربی تھی وہ فارسی رسم الخط استعمال کرتے تھے۔ اسی رسم الخط کو انھوں نے اردو کے لیے استعمال کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ زبان کے لیے ایک ایسا رسم الخط بہت ضروری ہے جس کا اپنا تہذیبی و معاشرتی پس منظر ہو۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری

زبان اور رسم الخط کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''زبان اور رسم الخط کا مکمل اور مناسب اجتماع و امتزاج زبان کو زندہ اور پائندہ بناتا ہے۔ اسی لیے کسی زبان کو اس کے رسم الخط سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ زبان کا ذکر آتے ہی ہر شخص کا ذہن ان حروف، خطوط اور اشکال کی طرف منتقل ہو ہی جاتا ہے جو اس زبان کے لیے مخصوص ہیں اور جن کے مجموعے کو خط کہا جاتا ہے۔''(۱۷)

زبان اور رسم الخط صرف بول چال اور پڑھنے لکھنے کی حد تک ہی اہمیت کے حامل نہیں ہیں بلکہ ہر قوم کی زبان اپنا ماضی، روایات، ثقافت، ادب اور علم و فن کی آئنہ دار ہوتی ہے۔ اگر کسی مرحلہ پر زبان کے رسم الخط کو تبدیل کر دیا جائے تو اس کا یہ انجام ہوگا کہ وہ قوم اپنے صدیوں کے قومی علمی و ادبی ورثے سے ہاتھ دھو بیٹھے گی۔ اور یہ اتنا بڑا قومی نقصان ہوگا جس کی تلافی صدیوں میں بھی نہیں کی جاسکتی۔ یہی حال ہماری زبان اور اس کے رسم الخط کا ہے ہماری زبان اور اس کے رسم الخط کی حیثیت صرف ادبی اور علمی ہی نہیں بلکہ قومی بھی ہے۔ سید قدرت نقوی لکھتے ہیں:

''اردو اور اس کے رسم الخط سے ہمارا رشتہ بہت قدیم ہے اردو صرف زبان کا نام ہی نہیں بلکہ ایک تہذیبی علامت بھی ہے۔''(۱۸)

برصغیر میں اردو ہندی تنازع کا اصل محرک رسم الخط کی تبدیلی تھا۔ ہندو اردو زبان کے لیے دیوناگری رسم الخط رائج کرنا چاہتے تھے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو برصغیر کے مسلمانوں کو ان کے شاندار ماضی، معاشرتی روایات اور تہذیبی و ثقافتی سرمائے سے دست بردار ہونا پڑتا۔ سید محی الدین قادری زور فورٹ ولیم کالج کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''فورٹ ولیم کالج کے ارباب حل و عقد نے اپنے ہندو منشیوں کو مشورہ دیا کہ وہ اس عام مشترکہ زبان کو اپنی قدیم ادبی زبانوں سنسکرت اور برج بھاشا رسم الخط میں لکھیں کیونکہ فارسی رسم الخط ہندوؤں اور ہندوستانیوں کے لیے بدیسی ہے جس طرح ہندو اور مسلمان صدیوں کے میل جول اور

یکجائی کے بعد بھی جداگانہ طرزِ معاشرت اور ذہنیت رکھتے ہیں ضروری ہے
کہ ان کا رسم الخط بھی ان کی ضروریات اور رجحانات کے مطابق جدا ہو۔"(۱۹)

غیر ترقی یافتہ قوموں کے پاس ان کا شمار ماضی، علمی ورثہ، کتب خانے اور زبان و بیان کے لیے اپنا رسم الخط نہیں ہوتا اسی لیے یہ قومیں دوسری ترقی یافتہ قوموں سے پیچھے رہ جاتی ہیں۔ عربی رسم الخط تھوڑی بہت تبدیلی کے بعد اسلامی ممالک میں استعمال ہو رہا ہے اردو زبان میں یہی رسم الخط تھوڑی بہت ترمیم کے بعد رائج کر دیا گیا۔ عربی زبان کا تعلق سامی زبان کے خاندان سے ہے۔ اہلِ ایران نے فارسی زبان کے لیے عربی رسم الخط پر انحصار کیا۔ پاکستان اور ہندوستان میں بھی یہی رسم الخط مقبول اور رائج رہا۔

عربی رسم الخط سامی زبان کے لیے مخصوص ہے جبکہ فارسی اور اردو زبانوں کا تعلق ہند آریائی زبانوں سے ہے جو کہ سامی زبانوں سے بہت مختلف ہیں۔ بہت سی آوازیں جو کہ سامی زبانوں میں ہیں آریائی زبانوں کی بہت سی اصوات سامی زبانوں میں نہیں ملتیں۔ پروفیسر سید محمد سلیم لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کی جدت پسندی اور قوت اختراع کا یہ کرشمہ ہے کہ
انھوں نے سامی لباس کو آریائی جسم کا جامۂ زیبا بنا دیا۔ مدتوں تک اہلِ علم اور
اہلِ فن اس کی تراش خراش میں مصروف ہیں۔"(۲۰)

اردو زبان کا دامن بہت وسیع ہے۔ دوسری زبانوں کے الفاظ کو اس نے ہمیشہ گرم جوشی سے خوش آمدید کہا ہے۔ اردو میں دوسری زبان کے الفاظ بکثرت موجود ہیں۔ زبان کی طرح اردو کا رسم الخط بھی اپنی جگہ جامعیت کا حامل ہے۔ کوئی دوسرا رسم الخط اس قدر جامع اور ہمہ گیر نہیں ہے جتنا کہ اردو رسم الخط۔ عربی رسم الخط جس سے اردو رسم الخط ماخوذ ہے، کے تمام حروف اردو رسم الخط میں موجود ہیں جبکہ اردو رسم الخط کے تمام حروف عربی رسم الخط میں نہیں پائے جاتے۔ عربی زبان کے حروف تہجی مندرجہ ذیل ہیں:

ا ب ت ث ج ح خ د ذ ر ز س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک ل م ن و ہ ء ی

حروف تہجی کی اس ترتیب کو ابتث کہا جاتا ہے اس ترتیب کو ابن مقلہ (۹۲۳ء) نے

پیش کیا۔ اردو حروف تہجی کی ترتیب اضافے کے ساتھ اس طرح بنتی ہے

ا ب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ ز ژ س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک

گ ل م ن و ہ (ھ) ء ی ے

عربی رسم الخط میں ۲۹ حروف اور اردو میں ۳۷ حروف ہیں ناگری رسم الخط میں ۴۷ حروف تہجی اور رومن رسم الخط میں ۲۶ حروف تہجی ہیں۔ رومن حروف تہجی اسمائی ہیں اصواتی نہیں۔ ان میں اظہار اصوات کی کوئی باقاعدہ صورت نہیں ہے۔

عربی کی طرح فارسی رسم الخط کے تمام حروف اردو خط میں موجود ہیں جبکہ اردو کے چند حروف فارسی میں نہیں ہیں یہ وہی حروف ہیں جو اردو نے ہندی زبان سے لیے ہیں۔ اسی طرح ہندی زبان کے تمام حروف ماسوائے تین چار سنسکرت کے حروف کے اردو زبان نے عربی زبان سے لیے ہیں یہ آٹھ حروف ہیں ث، ح، ط، ظ، ع، غ، ق، ک۔ ہندی زبان کے مفرد حروف بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، کھ، گھ، کو اردو خط میں مرکب قرار دے کر ادا کرنے ایک قاعدہ وضع کر لیا ہے۔ عبدالقدوس ہاشمی لکھتے ہیں:

''اردو رسم الخط اگرچہ فارسی رسم الخط سے لے کر بنایا گیا ہے لیکن اسے بعینہ فارسی کا رسم الخط نہیں کہہ سکتے کیوں کہ اگر نسبت اصل کی طرف ہی منظور ہے تو ہندی رسم الخط کو بھی سنسکرت بلکہ قدیم سامری رسم الخط کہا کیجیے کیوں کہ تاریخ کا وسیع علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ ناگری میں اپنا حصہ اس سے زیادہ نہیں جتنا اردو رسم الخط میں اپنا اردو کا ہے۔''(۲۱)

اردو کا رسم الخط صرف اردو زبان ہی نہیں بلکہ کئی زبانوں کو مدنظر رکھ کر بنایا گیا ہے۔ اردو کے رسم الخط کے حوالے سے رؤف پاریکھ لکھتے ہیں:

''اردو کا رسم الخط بنیادی طور پر اس سامی رسم الخط کی ترمیم شدہ شکل ہے جو عربی لکھنے میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ رسم الخط پہلے ایران پہنچا اور وہاں سے برعظیم پاک و ہند۔ فارسی زبان میں بعض ایسی آوازیں ہیں جن کو ظاہر کرنے کے لیے عربی میں حروف نہیں تھے۔ مثلاً ''چ''، ''گ'' اور ''پ'' فارسی

کی صوتیات کو مدنظر رکھتے ہوئے اہلِ ایران نے عربی حروف میں ترمیم واضافے
کے ذریعے، مثلاً ''ب'' اور ''ج'' کے نقطوں میں اضافہ کر کے یا کاف کی
کشش کو دہرا کر کے، عربی رسم الخط کو اپنی ضروریات کے مطابق بنالیا۔ جب
مسلمان اس رسم الخط کو لے کر ہندوستان آئے تو اس طرح کی ترمیم واضافہ
سے اسی رسم الخط میں سنسکرت اور دراوڑی زبانوں کی ان آوازوں کو لکھا جانے
لگا جو عربی اور فارسی میں وجود نہیں رکھتی تھیں مثلاً ''ٹ''، ''ڈ'' اور ''ڑ''۔۔۔
جہاں تک آوازوں کا معاملہ ہے تو اردو کو یہ فخر حاصل ہے کہ حروف تہجی کی تعداد
کے لحاظ سے وہ ایک اتنی ثروت مند زبان ہے کہ تقریباً ہر آواز کو ادا کر سکتی ہے
چاہے وہ عربی کا ''ق'' ہو یا فارسی کا ''ژ'' ہو یا سنسکرت / دراوڑی کا ''ڑ'' اور
''گھ'' اردو میں ان آوازوں کو اسی طرح بولا اور لکھا پڑھا جا سکتا ہے۔''(۲۲)

عربی رسم الخط اختیار کرنے اور ان میں مضامین واسالیب کی ایک ہی طرز کی روایت قائم کرنے سے جہاں ملک کے مختلف علاقوں کی اندرونی زبانوں میں قربت و یگانگت کے آثار پیدا ہو کر ایک نئی مشترکہ، بین الصوبائی اور روز بروز کام آنے والی زبان کے ابھرنے اور نشو ونما پانے کے مواقع بڑھ گئے، وہاں بیرون ملک کی زبانوں خصوصاً عربی اور فارسی سے بھی ان کا صوری اور معنوی الحاق ہو گیا جس کی بنا پر برصغیر کی زبانیں وسیع لسانی، معنوی اور اسالیبی تجربات سے فائدہ اٹھانے کے قابل ہو سکیں، جو بیرون ملک کی زبانوں نے صدیوں کی محنت و کوشش کے بعد حاصل کیے تھے اور اس طرح جہاں ہندی بھاشا اور دوسری زبانیں الفاظ و تراکیب، علائم و رموز، تلمیحات و مصطلحات اور طرز و انداز کی دولت سے مالا مال ہونی شروع ہوئیں، ان کی محدودیت اور تعین بھی لامحدودیت اور لاتعینی کی صورت میں بدل گئی اور یہ اپنی رسم الخطی، اسلوبی اور مضامینی روایات کے ذریعے مشرق وسطیٰ، وسطِ ایشیا اور مغربِ اقصیٰ میں بولی اور سمجھی جانے والی زبانوں سے منسلک ہو گئیں۔(۲۳)

اردو کا تعلق آریائی زبان سے ہے اور اسے سامی عربی رسم الخط میں لکھا جاتا ہے۔
ہندی آریائی زبان ہے اور آریائی رسم الخط رکھتی ہے۔ اردو رسم الخط کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ

اس کے لکھنے میں بہت کم وقت درکار ہوتا ہے۔لفظ کم جگہ گھیرتے ہیں یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو کا رسم الخط وسعت اور ہمہ گیری میں اپنی نظیر آپ ہے یہ رسم الخط خوبصورت، مختصر اور واضح ہے اسے خط ترکیبی کہتے ہیں کیونکہ اس میں حروف کو جدا جدا لکھنے کی بجائے مرکب لفظ کی شکل میں حروف کو جوڑ کر لکھتے ہیں۔۔اس رسم الخط کو مختصر نویسی کے حوالے سے بھی اہمیت دی جا سکتی ہے۔مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

> ''اردو تحریر میں (مثل عربی فارسی کے) یہ عجیب بات ہے کہ الفاظ میں حروف پورے نہیں لکھے جاتے بلکہ ہر حرف کے لیے صرف ایک چھوٹا سا نشان بنا دیتے ہیں اس طور پر الفاظ نہایت مختصر ہو جاتے ہیں۔۔۔ مختصر نویسی جس کا رواج یورپ میں اب تھوڑے زمانے سے ہوا ہے وہ ہمارے یہاں صدہا سال سے موجود ہے۔''(۲۴)

دیوناگری کے بمقابلہ اردو خط ایک خلاصہ نویسی کا طریقہ ہے اور نہایت تیزی سے لکھا جاتا ہے جیسے کہ انگریزی میں پٹ مین کا شارٹ ہینڈ کا طریقہ زمانہ حال میں ایجاد ہوا ہے لیکن عربی خط کا شارٹ ہینڈ صدیوں سے جاری ہے۔ایک اچھا اردو لکھنے والا ایک تقریر لکھنے والے کی تقریر کو لفظ بہ لفظ ضبط تحریر میں لا سکتا ہے۔اور لطف یہ ہے کہ شارٹ ہینڈ کی تحریر کو جو دوبارہ لونگ ہینڈ یا معمولی خط میں لکھنا پڑتا ہے۔یہاں اس کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔جس اصول پر شارٹ ہینڈ ایجاد ہوا کہ حروف علت لکھنے میں نہ آئیں اور صرف حروف صحیح لکھے جائیں وہ پہلے ہی اردو خط میں ملحوظ ہے۔اسی طرح اسی طرح اردو میں ہر حرف ہندی یا انگریزی لونگ ہینڈ کی طرح مکمل اور سالم نہیں لکھنا پڑتا بلکہ ان کے چھوٹے سے چھوٹے جزو استعمال کیے بجاتے ہیں جیسا کہ لفظ صحیح میں ''ص ح ی ح'' سالم لکھنے کی بجائے ان کے چھوٹے چھوٹے حصے ملا کر ایک لفظ بنا دیا جاتا ہے اور قلم کو اتنی لمبی مسافت طے نہیں کرنی پڑتی۔(۲۵) ۱۹۸۱ء میں اردو رسم الخط میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔احمد جمیل مرزا تمغۂ امتیاز نے کمپیوٹر سے اردو کتابت کا طریقہ ''نوری نستعلیق'' ایجاد کیا۔

زبان اور رسم الخط کا قومی یک جہتی سے براہ راست تعلق ہوتا ہے۔اردو کا موجودہ

رسم الخط ہمارے قومی ادب اور تہذیب و ثقافت کی علمبرداری کے ساتھ ساتھ اسلامی اقدار سے بھی خصوصی تعلق رکھتا ہے اردو رسم الخط پر کشش، جدید اور متنوع ہے پورے ایشیاء میں اردو رسم الخط کے مقابلے میں کوئی رسم الخط نہیں ہے جو اردو کے رسم الخط جیسی لچک، جاذبیت اور ہمہ گیری و جامعیت کا دعویدار ہو۔

رسم الخط کا تعلق زبان کے ساتھ بہت ہی گہرا ہوتا ہے۔ جب تک رسم الخط کا وجود ہے زبان زندہ رہتی ہے یعنی رسم الخط ہی زبان کے لیے تازہ سانسوں کا کام دیتا ہے۔ رسم الخط زبان کے مزاج کو نکھارتا ہے اور زبان قوم کے مزاج کی تعمیر میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ زبان اور رسم الخط کے بارے میں بحث کرتے ہوئے سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

> ''ان میں سے اگر کسی ایک سے ترک تعلق کر لیا جائے اور اس کو بدل دیا جائے تو قومی زندگی کی بھی قلب ماہیت ہو جائے گی اور اگر دونوں کو خیر باد کہہ دیا جائے یا ان میں تبدیلی لائی جائے تو قوم کے لیے اپنی انفرادیت سے ہاتھ دھونا ناگزیر ہو جاتا ہے۔''(۲۶)

ماضی کی شاندار روایات، عظیم تہذیبی ورثہ اور اسلامی اقدار کے تحفظ کے لیے یہ ضروری ہے کہ قومی زبان کا رسم الخط کسی اور رسم الخط میں ڈھالنے یا تبدیل کرنے کی بجائے موجودہ خط ہی رہنے دیا جائے جو کہ عربی خط سے ماخوذ ہے۔ اس خط میں ہماری کئی سو سالوں کی علمی و ادبی تصانیف کا سرمایہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ ہم موجودہ رسم الخط کی وجہ سے عربی اور فارسی دونوں زبانوں کے گرانقدر تصنیفی ذخیرے سے بھی بجا طور پر مستفید ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم اپنے رسم الخط کو تبدیل کر دیں تو اس سے جو قومی نقصان ہوگا اس سے سب لوگ بخوبی آگاہ ہیں اس حوالے سے سید قدرت نقوی لکھتے ہیں:

> ''ہماری ادبی، مذہبی، علمی اور فنی لاکھوں کتابیں بے کار ہو جائیں گی ہماری آئندہ نسلیں ان سے محروم ہو جائیں گی ان کو جدید رسم الخط میں منتقل کرنے کا ذمہ کون اٹھا سکتا ہے۔''(۲۷)

زبان اور رسم الخط دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ ان میں جسم و روح کا تعلق ہے اور

وہ ایک دوسرے سے جدا ہو کر زندہ نہیں رہ سکتے۔ رسم الخط کو کسی زبان کا محض لباس سمجھنا درست نہیں بلکہ اس کی حیثیت جلد کی سی ہے اس لیے اسے زبان سے الگ کرنا ممکن نہیں اور اگر ایسا ہو تو اس کا نتیجہ زبان کی تباہی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ نیز ایسا کرنا نہ صرف یہ کہ زبان کے جسم اور جثّہ کے لیے بلکہ زبان کے سارے قدیم اثاثے اور ثقافتی ورثے کے لیے تباہ کن اور مہلک ثابت ہوتا ہے۔[۲۸] کیوں کہ اس سے نہ صرف یہ کہ زبان متاثر ہوگی بلکہ اس کے بولنے بھی اس نقصان میں برابر کے شریک ہوں گے۔ رسم الخط کی بناوٹ اور ساخت کا تعلق زبان سے تو ہوتا ہی ہے زبان کے ساتھ ساتھ زبان کے بولنے والوں سے ہوتا ہے۔ اور اس رسم الخط کا انحصار اس کے لکھنے والوں کے مزاج اور رویوں پر بھی ہوتا ہے۔ اور یہ عمل چند سالوں کی جدوجہد کی بجائے صدیوں کی ریاضت پر مبنی ہوتا ہے۔ شان الحق حقی اردو رسم الخط کے ساتھ ساتھ رومن رسم الخط کے حق میں ہیں:

> ''اگر رسم الخط کے تحفظ کی ضمانت موجود ہو تو رومن کے جزوی استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ سراسر فائدے کی صورت ہے۔ ایک کی جگہ دو وسیلے حاصل ہو جاتے ہیں۔ اس سے بھی کام لے سکتے ہیں اور اس سے بھی۔ تعلیم کی ابتدا اردو حروف ہی سے ہونی چاہیے۔ ان کے دشوار ہونے کی دلیل وزنی نہیں۔ اخبار، رسائل، کتابیں اردو ہی میں چھپنی چاہئیں، یعنی اردو کا اصلی خط وہی رہے جو ہے۔ مزید سہولت کے لیے حسب موقع رومن بھی استعمال کی جانی چاہیے۔''[۲۹]

جہاں تک اردو کو رومن رسم الخط میں لکھنے کا مسئلہ ہے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ موجودہ سائنس و انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ترقی یافتہ دور میں جہاں پڑھے لوگ انٹر نیٹ کے ذریعے پیغام رسانی کے لیے انگریزی اور اس کے ساتھ ساتھ رومن رسم الخط استعمال کر رہے ہیں وہاں عام لوگوں میں بھی موبائل فون کے ذریعے دوسروں کو پیغام بھیجنے کے لیے رومن رسم الخط کا چلن عام ہو رہا ہے۔ یوں اس خط میں لکھنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔ لیکن اردو پر اس کے کوئی مضر اثرات دیکھنے میں نہیں آئے۔

حوالہ جات

۱۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، دیباچہ مشمولہ اردو رسم الخط کے بنیادی مباحث، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۸ء، ص ۱۱

۲۔ بشیر محمود اختر: مقدمہ، مشمولہ اردو رسم الخط مرتبہ شیما مجید مقتدرہ قومی زبان، اسلام باد، ۱۹۸۹ء، ص ۷

۳۔ صادق حسین طارق، پروفیسر، اردو رسم الخط کا مسئلہ، اخبار اردو اسلام آباد، جون ۲۰۰۲ ص ۲۸

۴۔ محمد اسحٰق صدیقی۔ فن تحریر کی ایجاد سے پہلے، نگار، کراچی، جولائی ۱۹۵۳ء تا دسمبر ۱۹۵۴ء

۵۔ ابن وصی، الف سے @ تک، روحانی ڈائجسٹ دسمبر ۲۰۰۶ء، ص ۱۲۵

۶۔ رشید اختر ندوی، پاکستان کا قدیم رسم الخط اور زبان، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء، ص ۳۳ تا ۳۵

۷۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو رسم الخط کے بنیادی مباحث، ص ۱۶ تا ۱۸

۸۔ رشید اختر ندوی، پاکستان کا قدیم رسم الخط اور زبان، ص ۱۸۱

۹۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو رسم الخط کے بنیادی مباحث، ص ۱۶ تا ۱۸

۱۰۔ خلیل صدیقی، زبان کیا ہے، بیکن بکس، ملتان، ۱۹۸۹ء، ص ۹۱

۱۱۔ محمد سلیم، سید، پروفیسر، اردو رسم الخط، مقتدرہ قومی زبان، کراچی، ۱۹۸۱ء، ص ۲۹

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ بشیر محمود اختر، مقدمہ، اردو رسم الخط جلد اول، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، مرتبہ شیما مجید، ۱۹۸۹ء

۱۴۔ قدرت نقوی، سید، لسانی مقالات، جلد اول، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۸ء، ص ۱۷۹

۱۵۔ محمد صدیق شبلی، ڈاکٹر، اردو رسم الخط کا تحفظ مشمولہ ماہنامہ اخبار اردو اسلام آباد، مئی ۲۰۰۰ء، ص ۲

۱۶۔ محمد اسحٰق صدیقی، فن تحریر کی تاریخ، ماہنامہ ''نگار'' کراچی، اکتوبر ۱۹۵۴ء، ص ۲۰

۱۷۔ شوکت سبزواری، لسانی مسائل، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۶۲ء، ص ۲۶۹

۱۸۔ قدرت نقوی، سید، لسانی مقالات، جلد دوم، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۸ء، ص ۱۳۰۔

۱۹۔ محی الدین قادری زور، سید، ہندوستانی لسانیات، مکتبہ معین الادب، لاہور، ۱۹۵۰ء، ص ۱۲۸۔

۲۰۔ محمد سلیم، سید، پروفیسر، اردو رسم الخط، مقتدرہ قومی زبان، کراچی، ۱۹۸۱ء، ص ۳۸

۲۱۔ عبدالقدوس ہاشمی، ہمارا رسم الخط، (مرتبہ شیما مجید) ص ۵۱

۲۲۔ رؤف پاریکھ: رومن اردو کیوں؟ مشمولہ اردو دنیا، نئی دہلی، انڈیا قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ص ۱۷

۲۳۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، جلد ششم، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ص ۱۵۱

۲۴۔ عبدالحق، مولوی: اعراب، مشمولہ منتخب مقالات اردو املا ورموز اوقاف اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص ۱۸۸

۲۵۔ منشی محبوب عالم: اردو زبان اور اس کا رسم الخط، فتح محمد ملک، پروفیسر، سید سردار احمد پیرزادہ، تجمل شاہ (مرتبین)، پاکستان میں اردو، چوتھی جلد پنجاب، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ص ۳۴۱

۲۶۔ احتشام حسین، سید: زبان اور رسم الخط، مشمولہ رسم الخط مرتبہ شیما مجید، ص ۲۱۸

۲۷۔ قدرت نقوی، سید، لسانی مقالات، جلد اول، ص ۱۹۵

۲۸۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو زبان و ادب، الوقار پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۶۳، ۶۷

۲۹۔ شان الحق حقی، لسانی مسائل و لطافت، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ص ۷۵

اُردو کے حروفِ تہجی

ہر زبان کی بنیادی علامات کو حروف سے ظاہر کیا جاتا ہے جس پر اس زبان کی پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ یہ حروف زبان کا معیار اور مزاج کا تعین کرتے ہیں۔ بچے کو جب بولنا، پڑھنا یا لکھنا سکھایا جاتا ہے تو اس کی ابتدا انھی حروف سے کی جاتی ہے۔ سب سے پہلے حروف کی پہچان ہوتی ہے اس کے بعد ان حروف کی مدد سے الفاظ اور جملوں کی تشکیل کے مراحل سکھائے جاتے ہیں۔

انسان کی زبان سے جو مختلف آوازیں نکلتی ہیں ان کو لفظ کہتے ہیں اور زبان و دہاں کے اختلافِ جنبش سے آوازوں میں جو فرق پیدا ہوتے ہیں ان کا نام حرف ہے۔ انھیں حرفوں کو جو منہ اور زبان اور گلے میں ذرا ذرا فرق سے نئے نئے پیدا ہو جاتے ہیں حروف تہجی یا حروف ہجا کہتے ہیں۔ اردو میں حروف تہجی ۵۱ ہیں۔

ا، ب، بھ، پ، پھ، ت، تھ، ٹ، ٹھ، ث، ج، جھ، چ، چھ، ح، خ، د، دھ، ڈ، ڈھ، ذ، ر، رھ، ڑ، ڑھ، ز، ژ، س، ش، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، ف، ق، ک، کھ، گ، گھ، ل، لھ، م، مھ، ن، نھ، و، ہ، ء، ی [1]

اردو حروف تہجی کی اصل تعداد کا اس طرح تعین ہوگا:

ا، ب، ت، ث، ج، ح، خ، د، ذ، ر، ز، س، ش، ص،

ض، ط، ظ، ع، غ، ف، ق، ک، ل، م، ن، و، ہ، ء، ی	۲۹ عربی حروف
پ، چ، ژ، گ، ہا (ملفوظی)، یہ (مختفی)، ے (مجہول)	۷ فارسی حروف
ٹ، ڈ، ڑ (فارسی والوں کی اتباع میں اسی طریق پر وضع کیے)	۳ سنسکرتی وابدالی
ھ (عربی ملفوظی کو اردو علماء نے مرکب حروف کے لیے اختیار کیا	۱ عربی ابدالی
اس طرح یہ کل	۴۰ مفرد حروف بنتے ہیں۔

اردو توضیحی مرکب حروف جن میں دوچشمی ھ مخلوط کی جاتی ہے۔

بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، رھ، ڑھ، کھ، گھ، لھ، مھ، نھ، وھ، یھ ۱۷

۵۷ میزان

یوں ان ۱۷ مرکب حروف کو حروف تہجی میں شمار نہیں کرنا چاہیے۔ گویا اصل حروف تہجی کی تعداد یوں ۴۰ ہی بنتی ہے۔[۲]

میرے خیال میں اردو کے بنیادی حروف کی تعداد ۲۰ ہے جن میں بعض حروف پر نقطہ اور بعض حروف پر نقطہ کی بجائے ط کے اضافے یا آپس میں ترکیب سے دوسرے حروف تشکیل پاتے ہیں۔

ا، ب، ج، د، ر، س، ص، ط، ع، ف، ق، ک، ل، م، ن، و، ہ، ھ، ء، ی

غلام ربانی مجال نے ان بنیادی حروف کی تعداد ۲۳ گنوائی ہے۔ جو کہ درج ذیل ہیں

ا، ب، ج، د، ر، س، ص، ط، ع، ف، ق، ک، ل، م، ن، و، ہ، ٓ، ہا، ھ، ء، ی اور ے[۳]

۲۶ جنوری ۲۰۰۴ء کو مقتدرہ قومی زبان کے زیر اہتمام ایک اجلاس میں ایک جدول (چارٹ) کے ذریعے مختلف لغات کی مدد سے اردو کے مختلف حروف کی ترتیب کو واضح کیا گیا چونکہ کمپیوٹر پر انھی معیارات کو استعمال میں لایا جا رہا ہے لہٰذا اجلاس میں ڈاکٹر سرمد حسین، ڈاکٹر عطش درانی، کمپیوٹر بیورو اسلام آباد کے ڈائریکٹر سعید احمد اور بارانی یونیورسٹی راولپنڈی کے ڈاکٹر محمد افضل کی کمیٹی میں ان سفارشات کو حتمی شکل دی گئی۔ اور درج ذیل حروفِ تہجی اور ان کی ترتیب کو حتمی طور پر طے کیا گیا۔

ا، آ، ب، بھ، پ، پھ، ت، تھ، ٹ، ٹھ، ث، ج، جھ، چ، چھ، ح، خ، د، دھ، ڈ،
ڈھ، ذ، ر، رھ، ڑ، ڑھ، ز، ژ، س، ش، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، ف، ق، ک، کھ، گ، گھ، ل، لھ،
م، مھ، ن، نھ، ں، ںھ، و، وھ، ہ، ۃ، ء، ی، یھ، ے، ےَ، ےِ، ےُ، ےٰ، ےٌ، ےٍ، ےً، ''، اُ، اِ (۴)

شان الحق حقی نے اردو حروف تہجی کی تعداد ۵۲ بیان کی ہے۔ انھوں نے ھ کو الگ حرف لکھنے کی بجائے اسے ہ کا مترادف لکھا ہے۔ اسی طرح انھوں نے نھ کو بھی الگ حرف کے طور پر استعمال نہیں کیا۔

ا، آ، ب، بھ، پ، پھ، ت، تھ، ٹ، ٹھ، ث، ج، جھ، چ، چھ، ح، خ، د، دھ، ڈ،
ڈھ، ذ، ر، رھ، ڑ، ڑھ، ز، ژ، س، ش، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، ف، ق، ک، کھ، گ، گھ، ل، لھ،
م، مھ، ن، و، ہ (ھ)، ء، ی، ے (۵)

بابائے اردو نے قوعد اردو میں حروف تہجی کی تعداد پچاس لکھی ہے انھوں نے ھ کو حرف کے طور پر شمار نہیں کیا۔

ن اور ں کو بھی الگ الگ لفظ سمجھنا چاہیے۔ اگر ہم انھیں دو الگ لفظ نہ سمجھیں اور اگر ن اور ں کو ایک ہی حرف تسلیم کرلیا جائے تو صورتحال یوں ہوگی

میں، مین

یعنی ایک ہی لفظ میں صورتحال واضح ہو جاتی ہے کہ ن الگ معنی دے رہا ہے اور ں الگ۔ جب لفظ میں ں کو ن کی جگہ استعمال کیا گیا تو ایک علیحدہ اور الگ لفظ بن کر سامنے آ گیا۔

ڈاکٹر عطش درانی نے اردو حروف تہجی کی تعداد ۵۸ بتائی ہے اور لکھتے ہیں مقتدرہ قومی زبان میں ایک اجلاس مورخہ ۲۶ جنوری ۲۰۰۴ء میں طے پایا کہ کمپیوٹر، کتابت، اشاریہ سازی اور تدریس کے لحاظ سے اردو کے ۵۸ حروف تہجی الف تا یے حسب ذیل ہیں:

ا آ ب بھ پ پھ ت تھ ٹ ٹھ ث ج جھ چ چھ ح خ د دھ ڈ ڈھ ذ ر رھ ڑ ڑھ ز ژ س ش
ص ض ط ظ ع غ ف ق ک کھ گ گھ ل لھ م مھ ن نھ ں نھ و وھ ہ ۃ ء ی ے۔

ترتیب علامات: ا اَ اِ اُ اٗ ا اً ا'' اٌ ا آ (۶)

انگریزی کے حروف تہجی کی تعداد ۲۶ ہے جو کہ درج ذیل ہیں:

A,B,C,D,E,F,G,H,I,J,K,L,M,N,O,P,Q,R,S,T,U,V,W,X,Y,Z

ہندی کے حروفِ تہجی درج ذیل ہیں جو کہ ۳۵ ہیں۔

हिंदी की तख़ती ہندی کی تختی

क	ک،ق	ख	کھ،خ	ग	گ،غ	घ	گھ	ङ	ن
K	کا	Kh	کھا،خا	g	گا،غا	gh	گھا	n	نا
च	چ	छ	چھ	ज	ج	झ	جھ	ञ	ن
ch	چا	chh	چھا	j	جا	jh	جھا	n	نا
ट	ٹ	ठ	ٹھ	ड	ڈ	ढ	ڈھ	ण	ن
t	ٹا	th	ٹھا	d	ڈا	dh	ڈھا	n	نا
त	ت،ط	थ	تھ	द	د	ध	دھ	न	ن
t	تا،طا	th	تھا	the	دا	thhe	دھا	n	نا
प	پ	फ	پھ،ف	ब	ب	भ	بھ	म	م
p	پا	f,fh	پھا،فا	b	با	bh	بھا	m	ما
य	ی،ے	र	ر	ल	ل	व	و	श	ش
y	یا	r	را	l	لا	v	وا	sh	شا
स	ث،س،ص	ह	ح،ھ،ہ	ष	ش	क्ष	کھش	श्र	شر
(۷) s	سا	h	ہا	shh	شا	ksh		shr	

ہندی میں الف کی آوازیں الگ ہیں، جن کی تعداد ۱۲ ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے:

ای	ई	اِ	इ	آ	आ	ا	अ
	ee		i		aa		a
اَیے	ऐ	اے	ए	اُو	ऊ	اُ	उ
	aae		ae		oo		u
آں	आं	اَن	अं	اَوو	औ	او	ओ
	aan		an		au		o

(۸)

اردو حروف تہجی کا فائدہ ایک یہ بھی ہے کہ ان کی مدد سے ہم بآسانی فارسی اور عربی زبان سیکھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ کیونکہ تینوں کا رسم الخط ایک ہی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اردو کے حوالے سے پندرہ بنیادی شکلیں گنوائی ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ ا

۲۔ ب، پ، ت، ٹ، ث

۳۔ ج، چ، ح، خ

۴۔ د، ڈ، ذ

۵۔ ر، ڑ، ز، ژ

۶۔ س، ش

۷۔ ص، ض

۸۔ ط، ظ

۹۔ ع، غ

۱۰۔ ق

۱۱۔ ک، گ

۱۲۔ ل

۱۳۔ م

۱۴۔ ہ

۱۵۔ ی[۹]

ہمیں فارسی سے ۳۴ علامتیں ملیں۔ ان میں دو حروف علت اور چودہ حروف صحیح بھ، پھ، تھ، دھ، جھ، چھ، کھ، گھ، ٹ، ڈ، ڑ، ٹھ، ڈھ، ڑھ یعنی کل سولہ علامتوں کا اضافہ کر کے ہم نے ایک نیا ملا جلا رسم الخط بنایا ہے جو اب تک اردو کے فطری تقاضوں کا ساتھ دیتا رہا ہے۔[۱۰]

انسان کا لہجہ اور تلفظ کبھی حروفِ تہجی کا پابند نہیں رہا۔ رومن جیسے بے عیب و پاک ذات رسم الخط میں بھی ہم انگریزی الفاظ کو انگریز سے مختلف تلفظ اور لہجے کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔۔۔ املا یا تحریر کی کوئی رسم، کوئی ضابطہ، کوئی قانون انسانی آوازوں کو گرفت میں نہیں لا سکتا۔ حروف صرف نشان ہوتے ہیں ذہن کی رہبری کے لیے۔ ان کو اکمل اور اتم بنانے کی کوشش لا حاصل ہے۔[۱۱]

ہر اصطلاح معنی کا ایک مخزن ہوتی ہے۔ اس کا پورا ایک معنوی سیاق ہوتا ہے اور سیاق کی مناسبت سے اس کے انسلاکات کا دائرہ بھی خاصا وسیع ہوتا ہے۔ اس کا سنگِ در محض کھل جا سم سم سے باز نہیں ہوتا بلکہ اسے اپنے ذہن و فہم کا حصہ بنانے کے لیے مختلف علوم اور متعلقہ تاریخ و سماج کے پس منظر کا گہرا مطالعہ بھی از بس کہ ضروری ہے۔ باوجود اس کے اکثر اصطلاحات کے تعلق سے کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس پر ان کے تمام یا اصل معنی آشکار ہو گئے ہیں۔[۱۲]

حوالہ جات

۱۔ مولوی فتح محمد خان، مصباح القواعد، پی، سی، دوادش شرینی اینڈ کمپنی علی گڑھ، ہیرالال پرنٹنگ پریس علی گڑھ، ۱۹۳۸ء، ص ۸

۲۔ اردو حروف تہجی کے ماخذ از غلام ربانی مجال، اخبار اردو اسلام آباد، اگست ۲۰۰۵ء، ص ۴۲

۳۔ اردو حروف تہجی کے ماخذ از غلام ربانی مجال، اخبار اردو اسلام آباد، اگست ۲۰۰۵ء، ص ۴۲

۴۔ عقیل عباس جعفری، اردو کے حروف تہجی کی ترتیب، اخبار اردو اسلام آباد، اگست ۲۰۰۴ء ص ۲۰

۵۔ شان الحق حقی، فرہنگ تلفظ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۹۵ء، ص م

۶۔ ڈاکٹر عطش درانی، اردو حروف تہجی کی معیاری ترتیب، اخبار اردو اسلام آباد، اگست ۲۰۰۴ء ص ۴۰

۷۔ اخلاق حیدر آبادی، ہندی زبان: رسم الخط اور بنیادی معلومات، شعبۂ اُردو، جی۔سی۔یونیورسٹی، فیصل آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۳۱

۸۔ ایضاً، ص ۳۰

۹۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو زبان وادب، الوقار پبلی کیشنز، لاہور ص ۷۵، ۷۶

۱۰۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، اردو زبان اور لسانیات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۱۱۱

۱۱۔ شان الحق حقی، لسانی مسائل ولطائف، ص ۸۲

۱۲۔ عتیق اللہ، ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ، جلد اول A تا D، اردو مجلس دہلی، ۱۹۹۵ء، ص ۱۲

اُردو زبان، رسم الخط اور املا

زبان ان با قاعدہ آوازوں کے مجموعے کو کہتے ہیں جن کے ذریعے خیالات واحساسات کا اظہار ممکن ہے۔ آوازوں کے مخارج، طرزِ ادا، ماہیئت اور نوعیت مل کر معنوی ساختوں کو جنم دیتے ہیں۔ ہر آواز کچھ اختیاری علامتوں پر مشتمل ہوتی ہے ان علامتوں کو ہم الفاظ وحروف کی وساطت سے صفحہ قرطاس پر ظاہر کرتے ہیں مگر تمام آوازوں کی ترجمانی الفاظ میں ہونا ممکن نہیں۔ ہر آواز مختلف خصوصیات کی حامل ہوتی ہے ایک آواز کا سُر (Pitch) اور ارتفاع (Amplitude) دوسری آواز کے سُر اور ارتفاع سے مختلف نوعیت کا ہوتا ہے۔ زبان فکر و بیان، افہام وتفہیم اور تشریح وتوضیح کے حوالے سے بنیادی کردار کی حامل ہوتی ہے۔ اس کی اہمیت تسلیم شدہ ہے یہ اظہار و ابلاغ کا موثر ذریعہ (Source of Communication) ہے۔ زبان کی مدد سے ہم اپنی بات دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں اور زبان ہی وہ وسیلہ ہے جو شعور و آ گہی کو فکر اور سوچ کی با قاعدہ صورت عطا کرتا ہے۔ زبان ہی کے ذریعے معاشرے اور سماجی گروہوں میں معاونت اور یک رنگی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ زبان میں لفظوں اور چھوٹے چھوٹے فقروں پر مشتمل جملے انسانی خواہشات کی ترجمانی کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔

عتیق احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''زبان کیا ہے؟ زبان درحقیقت مفروضہ صوتی علامات کا مجموعہ
ہے جسے انسان اپنے ماضی الضمیر کے ابلاغ کے لئے استعمال کرتے ہیں۔
ابلاغ کے عمل اور ردِ عمل اور اس کے تکرار سے ان صوتی علامتوں کے معنی اور
تعبیرات متعین ہوتی ہیں۔''(۱)

زبان کا ڈھانچہ ان صوتی علامات پر مشتمل ہوتا ہے جو اظہار و بیان کے حوالے سے معنوی ربط رکھتی ہیں اور ایک با قاعدہ معنوی نظام کی تشکیل کا سبب بنتی ہیں یہ صوتی علامات (Symbols of Sound) ہماری اپنی وضع کردہ ہیں جو مختلف وجوہات کی بنا پر ہم مختلف اشیاء کے لیے استعمال کرتے ہیں اور یہ علامات سالہا سال کی تاریخ اور روایتوں پر مبنی ہیں جن کا استعمال صدیوں سے ہوتا آرہا ہے۔ اس عمل میں شعوری اور غیر شعوری دونوں قسم کی کوششوں کا دخل ہے۔

آوازوں اور صوتی علامات کا علم یعنی علم الاصوات (Phonology)، لہجہ (Intonation)، سُر (Pitch) زور (Stress) اور زیر و بم (Modulation) جیسی اہم اکائیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ اکائیاں معنوی حوالے سے نہایت اہم کردار کی حامل ہوتی ہیں۔ زبان میں آوازوں کے لئے استعمال ہونے والی علامات میں تبدیلی کا امکان ہر وقت موجود رہتا ہے۔ ان نشانات و علامات کو دوسری صوتی علامات (Symbols of Sound) سے بھی تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ جب ہم زبان کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہیں تو لوگ اس حقیقت کو سمجھتے ہیں کہ زبان کے وسیلے کے بغیر ہم ایک دوسرے کی بات کو بہتر انداز میں سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی معاملات زندگی کی خوش اسلوبی سے نمٹا سکتے ہیں یعنی زبان اجتماعی شعور اور ہمہ گیر زندگی کی ضمانت فراہم کرتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ زبان ہر شخص کی ذاتی اور نجی ضروریات و خواہشات میں بھی دخیل ہے کیونکہ زبان کی عدم موجودگی میں ہم اپنی خواہش کا اظہار آسانی سے نہیں کرسکتے۔ زبان اور الفاظ و حروف کے مجموعے کے بغیر ہم نہ سوچ سکتے ہیں اور نہ ہی غور و فکر کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہوسکتے ہیں۔ ہم جب بھی سوچنے کا عمل شروع

کریں گے یا ذہنی کام انجام دیں گے تو وہ ایک پوری ترتیب اور تنظیم کے ساتھ کسی نہ کسی شکل یا الفاظ کی صورت میں ہمارے ذہن کی سطح یا شعور کی تختی پر نمودار ہوگا۔ اگر یہ الفاظ اور علامات ان سوچوں کی صورت گری کے لئے موجود نہ ہوں تو ذہنی رو کو وہ واسطہ (Media) نہ مل سکے گا جو کہ ترسیل وابلاغ کے لئے نہایت ضروری ہے۔ زبان میں ان علامتی اکائیوں کو بنیادی اور اساسی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ خلیل صدیقی لکھتے ہیں:

''ان علامتوں کے ذریعہ سے سامع کے ذہن کی رسائی معانی و مطالب تک ہوتی ہے علامتوں ہی کی بدولت موضوعی و معروضی حقائق کو منظر عام پر لانا اور جذباتی، ذہنی اور سماجی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونا ممکن ہو جاتا ہے۔''(۲)

زبان مکمل طور پر جذبات کی عکاسی اور احساسات کی ترجمانی کے سلسلہ میں مجبور ہے مگر اس کے باوجود یہ بڑی حد تک انسانی خواہشات وضروریات کو الفاظ ومعانی کا ملبوس پہنا کر اپنی افادیت کے احساس کو زندہ رکھتی ہے۔ زبان میں آوازیں، کلموں، فقروں اور جملوں کی صورت میں تشکیل پاکر معنویاتی نظام ترتیب دیتی ہیں۔ جملوں میں جس قدر باقاعدگی اور تنظیمی تناسب کا خیال رکھا جائے گا معنویاتی نظام میں اسی قدر توازن پایا جائے گا۔ زبان کی ساخت میں صوتی اور صرفی ونحوی نظاموں کی مطابقت سے ایک ایسا مرکب نظام وجود میں آتا ہے۔ جس کا تعلق براہِ راست بول چال سے ہوتا ہے۔ بقول انیس ناگی لکھتے ہیں:

''زبان اور الفاظ کی معنویت کا دارومدار اس کے سیاق وسباق پر ہوتا ہے، سیاق وسباق کا تنوع زبان کی وسعت اور ہمہ گیری پر دلالات کرتا ہے۔ زبان کے دو سیاق وسباق ہوتے ہیں، ان میں سے ایک نفسیاتی اور دوسرا منطقی ہوتا ہے۔ نفسیاتی سیاق وسباق کا تعلق پرسپشن سے ہے۔ منطقی سیاق وسباق کا تعلق منطق اور گرائمر سے ہے۔''(۳)

زبان فکری منصب اور ذہنی سرگرمی میں بھی ہمیشہ سے فعال کردار ادا کرتی رہی ہے۔ جو حقائق خاموشیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں یا ذہن کے خوابیدہ حصوں

میں موجود ہوتے ہیں انھیں فہم وادراک تک لانا اور سوچوں کی تنظیم کر کے ان کو معنی پہنانا بھی زبان ہی کے حصے میں آتا ہے۔ زبان فکر اور سوچ کا تعلق بول چال سے استوار کر کے ابلاغ و ترسیل کے فرائض سرانجام دیتی ہے۔ افکار کی بازیافت اور معانی کی دریافت میں زبان کا کردار کلیدی نوعیت کا ہوتا ہے۔ تصور سازی اور تمثال گری کے پیچھے بھی زبان ہی کارفرما ہوتی ہے۔ زبان تکلمی علامات کی شکل میں کلام (Utterance) کو معانی اور مفاہیم سے ہمکنار کرتی ہے۔ تکلمی علامات کا یہ نظام طویل تدریجی ارتقا کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اس وقوع پذیری کے دوران زبان بہت سی صوتی تغیرات سے گزرتی ہے۔

انسانی ذہن کے ارتقا اور تہذیبی و ثقافتی ترقی میں سب سے زیادہ مرکزی کردار زبان ہی نے ادا کیا ہے۔ اسی لیے زبان اور علم اللسان (Philology) پر ہر دور میں کام ہوتا رہا ہے۔ نظام لسّان (Linguistic System) میں معنوی نظام (Semology یا Semantics) بھی سرگرم عمل رہتا ہے کیونکہ زبان سے نکلا ہوا ہر جملہ کوئی نہ کوئی معنی رکھتا ہے۔ کلام (Utterance) کا محرک اور جملے کا مقصد دراصل معنی کی ترسیل اور خیالات کا ابلاغ ہوتا ہے ہر جملہ قواعد اور گرائمر کے اُصولوں کے تابع ہوتا ہے اور اس میں گرائمر کے نظام (Gramatic System) کے ساتھ ساتھ صوتی نظام (Phonatic System) اور معنوی نظام (Semologi) کی بھی کارفرمائی ہوتی ہے۔ تکلمی آوازیں (Articulated Sound)، صوتی سانچے (Phonatic Structure) کو کلموں کی شکل دے کر لسانی نظام (Linguistic System) کو تشکیل دیتی ہے۔

علم الانسان (Anthropology) اور علم اللسّان (Philology) کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ زبان کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ انسانی تاریخ، زبان کا ارتقا اور نسل انسانی کی ترقی دونوں ساتھ ساتھ پہلو بہ پہلو چلتے نظر آتے ہیں۔ انسانی معاشرے کی تشکیل اور ارتقا میں زبان کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے اور اس حوالے سے زبان اور تحریر کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔ ہمارے لاشعور (Sub-conscious) میں موجود اشیاء زبان کی

وساطت سے شعور (conscious) اور پھر ہونٹوں تک آ کر تفہیم وتشریح کے قالب میں ڈھل کر دوسروں تک پہنچ جاتی ہیں۔ صوتی علامات کچھ باتوں اور اشیاء کو حافظے میں آئندہ کے لئے محفوظ کر لیتی ہیں اور باقی کو ہونٹوں اور زبان کی مشترکہ مخصوص جنبش کے ذریعے معنوی روپ عطا کر دیتی ہیں۔ بول چال میں لب ولہجہ ساختیاتی اشارے (Structural Signals) کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ تحریر میں اس مقصد کے لئے رموز واوقاف (Punctuation) سے مدد لی جاتی ہے۔ زبان نہ صرف تشہیر وتفہیم کے کام آتی ہے بلکہ یہ فکری اکائیوں اور جذباتی رویوں کو تکلمی صورت میں ڈھالنے کے عمل میں بھی استعمال ہوتی ہے۔

زبان میں مختلف علاقائی اثرات اور تہذیبی وثقافتی تغیرات کی وجہ سے لب ولہجہ کا اختلاف وقوع پذیر ہوتا رہتا ہے جس کی وجہ سے زبان میں لسانی تبدیلیوں کی وقوع پذیری عمل میں آتی ہے۔ یہ عمل صوتی اختلاف سے ہوتا ہوا تلفظ اور املا کے انحراف تک جا پہنچتا ہے۔ املا کی تبدیلی لیکن بہت کم ظہور پذیر ہوتی ہے کیونکہ املا کی مروجہ قوانین سے انحراف کرنا یا ان میں تبدیلی لانا خاصا دشوار کام ہوتا ہے کیونکہ یہ کام انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی تحریک مانگتا ہے۔ زبان اور لسانیات کی مستقل اکائیوں میں روزمرہ (Collocation)، محاورہ (Idiom)، کہاوتیں (Sayings)، ضرب الامثال (Maxims)، مترادفات (Synomyns) اور متضادات (Opposite words) وغیرہ ارتقائے زبان میں اہم کردار کی حامل ہوتے ہیں۔ بعض اوقات سماجی ومعاشرتی تقاضے دوسری زبانوں سے لسانی استفادے کے متقاضی ہوتے ہیں مگر یہ لسانی استفادہ اسی صورت میں مفید اور کارآمد ہو سکتی ہے جب کہ مستعار لیے گئے الفاظ کا مزاج، ساخت اور بناوٹ کو مکمل طور پر اپنی زبان کے مزاج کے ہم آہنگ کر کے اس میں ضم نہ کر لیا جائے۔ الفاظ وتراکیب کو جذب کرنے کے اس عمل کی وجہ سے زبان میں علمی وادبی اور تہذیبی وثقافتی اثرات کے ساتھ ساتھ الفاظ ومعانی میں نیا پن اور اسالیب میں جدت وندرت بھی پیدا ہوتی ہے اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر یہ لسانی استفادہ بے فائدہ ہے خلیل صدیقی لکھتے ہیں:

"تہذیبی ارتباط کی نوعیت کیسی ہی کیوں نہ ہو دوسری تہذیب یا
تہذیبوں کار آمد اور نئی مادی اشیاء سے ہی فائدہ نہیں اُٹھایا جاتا بلکہ ان
تہذیبوں کو بہتر سمجھ کر ان کے بہت کچھ عکسی، بعض بیوہاری صورتیں، کچھ تنظیمی
انداز، چند فکری زاویوں وغیرہ کو بھی اختیار کر لیا جاتا ہے۔"(۴)

قومی زندگی میں زبان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ زبان ہر فرد سے اس طرح تعلق رکھتی ہے کہ اسے کسی بھی صورت میں فرد سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ زبان ہر وقت فرد کے ساتھ رہتی ہے۔ زبان کی نشو و نما کا اثر فرد کی ذہنی و جسمانی نشو و نما پر براہِ راست پڑتا ہے انسان کی نجی اور اجتماعی زندگی دونوں زبان کے وسیلے کی محتاج ہیں۔ زبان انسانی معاشرے میں ترتیب، تنظیم اور تہذیب کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ زبان کی وجہ سے ثقافت نئی کروٹ لیتی ہے۔ روایتیں نیا ملبوس پہنتی ہیں اور انسانی زندگی میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔ معاشرے کا کوئی بھی طبقہ ہو بغیر زبان کے ارتقائی منازل طے نہیں کر سکتا۔ زبان کی ترقی ہی کی بدولت قومیں عروج اور کمال حاصل کرتی ہیں۔ جن قوموں کی زبان میں جس قدر قوت اور توانائی ہوگی وہ قومیں اسی قدر مستحکم ہوں گی اور جدید خطوط پر خود کو استوار کر سکیں گی۔ محمد ساجد خاکوانی لکھتے ہیں:

"زبان کا ارتقا ایک فرد سے لے کر قوم تک اور اس سے بڑھ کر
کسی بھی خطے کی تہذیبی، ثقافتی اور شعوری و فکری پختگی کا پتہ دیتا ہے۔۔۔
مطالعہ اقوام شاہد ہے کہ اقوام کی شکست کا آغاز زبان کی شکست سے ہوتا
ہے۔"(۵)

قومی انحطاط زبانوں کے زوال سے عبارت ہے تہذیب و ثقافت اور علم و ادب کا سرچشمہ دراصل زبان ہی ہے۔ زبان جس قدر وسیع اور فصیح ہوگی۔ زبان کے ذریعے قدیم سے لے کر جدید اور مذہبیات سے لے کر سائنس و ٹیکنالوجی جیسے مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اہل زبان اسی قدر شائستہ اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کے مالک ہوں گے۔ زبان ہی کے ذریعے قومیں اپنے خیالات و افکار اور نظریات و عقائد کی ترجمانی کا کام سرانجام دے سکتی ہیں۔ فرد

سے زبان کا گہرا تعلق ہے۔ اسی طرح ایک تعلق زبان کا اس کے رسم الخط (Script) سے بھی ہے۔ صوتی علامات (Phonatic Signals) کو مختلف نقوش اور تصاویر کے ذریعے صفحہ قرطاس پر ظاہر کیا جاتا ہے۔ ان تصویری علامات و نقوش (Pictography) کی ترقی یافتہ شکل حروف اور الفاظ کی صورت میں ہر زبان کے رسم الخط میں موجود ہے۔ آواز کو حرف کی شکل میں پیش کرنے کے عمل کو صوتیت (Phoneticisim) کہا جاتا ہے الفاظ کے حوالے سے بات کرتے ہوئے سید قدرت نقوی لکھتے ہیں کہ:

''الفاظ قوموں کے عروج و زوال کا آئینہ دار ہوتے ہیں خود اپنے اندر ایک عالم پنہاں رکھتے ہیں۔''(۶)

ہر زبان کا اپنا مزاج ہے اور اسی مزاج کے حوالے سے اس کا رسم الخط بھی ترتیب پاتا ہے۔ اگر کسی زبان کو اس کے مخصوص رسم الخط سے ہٹ کر کسی دوسرے رسم الخط میں لکھا جائے تو ادائیگی مطالب میں نہایت دشواری کا سامنا ہوگا ممکن ہے کہ اس سے زبان کا اسلوب اور ڈھانچہ مکمل طور پر متاثر ہو کر شکست و ریخت کا شکار ہو جائے۔ زبانیں اور اُن کے رسم الخط مل کر تہذیبوں کی پرورش کرتے ہیں اور علم و ادب کو پروان چڑھانے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ زبان اور رسم الخط کی تبدیلی پوری ثقافت اور تمدن کی تبدیلی پر منتج ہو سکتی ہے کیونکہ مخصوص زبان اور اس کے رسم الخط سے انحراف دراصل اپنے اسلاف کے قدیم سرمایہ علمی سے منقطع ہونے کا دوسرا نام ہے۔ زبان اور رسم الخط کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہونا چاہیے کیونکہ رسم الخط کا تعلق زبان کے ساتھ نہایت گہرا اور اٹوٹ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر محمد صدیق شبلی لکھتے ہیں:

''خط کی تبدیلی قوم کو اس کے ماضی سے کاٹ دیتی ہے۔ ماضی کا سارا سرمایہ اس کے لیے بے معنی ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اس کام کی مزاحمت کی جاتی ہے۔''(۷)

رسم الخط کی تبدیلی سے ہم اپنے آباؤ اجداد کے ان خیالات و افکار سے محروم ہو جائیں گے جو کہ صدیوں کی محنت اور ریاضت کا ثمر ہیں۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے ہمیں نئے افکار اور

علم وادب کا ڈول ڈالنا ہوگا جس میں کئی صدیاں درکار ہیں۔ اس تبدیلی سے نہ صرف قوموں کا مزاج تبدیل ہو جاتا ہے بلکہ اخلاقی اور قومی شعور پر بھی اس کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ قومیں جو زبان اور رسم الخط اختیار کرتی ہیں پھر انھیں اسی زبان اور رسم الخط میں موجود علم وادب کے خزانوں سے خیالات وافکار مستعار لینے پڑتے ہیں جو کہ ان کے مزاج اور ثقافت سے یکسر مختلف ہوتے ہیں اور انھیں اپنے مزاج سے ہم آہنگ کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔

اُردو زبان برصغیر کے مختلف علاقوں میں رابطہ کی زبان کے طور پر بولی جاتی تھی اور مختلف علاقوں میں اس کے مختلف نام تھے اُردو بذاتِ خود کسی نسل یا علاقے سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ اس کی پرداخت میں بہت سے عوامل کارفرما رہے ہیں۔ سید شبیر علی کاظمی کے بقول:

> ''اس کے ارتقا میں مختلف نسلیں اور زبانیں معاون رہی ہیں اور اس پر ابتداء ہی سے مختلف النوع تہیں چڑھتی رہی ہیں۔ اس کی اُٹھان کا رقبہ اتنا وسیع اور اس کے شیون اتنے متنوع اور متعدد ہیں کہ محققین زبان ابھی تک قطعی طور پر اس کے آغاز کے متعلق کسی متفقہ فیصلے پر نہیں پہنچ سکے ہیں۔''(۸)

اُردو زبان عرصہ دراز سے سرزمین ہند کے طول وعرض میں کسی نہ کسی شکل میں بولی اور لکھی جاتی رہی ہے۔ اُردو زبان کے ارتقا کی داستان نہایت طویل ہے۔ اس زبان میں ہند آریائی اور ہند اسلامی دونوں قسم کی خصوصیات پائی جاتی ہیں یہ زبان مختلف زمانوں کے لسانی اشتراک سے وجود میں آئی ہے۔ شروع میں اُردو زبان مختلف علاقوں میں صرف ایک بولی (Dialect) کی حیثیت سے جانی پہچانی جاتی تھی مگر رفتہ رفتہ اس نے باقاعدہ زبان کے خدو خال اختیار کر لیے اور پورے برصغیر کو اپنی قلمرو میں شامل کر کے ایک مقبول ترین زبان کی شکل میں دنیا کے سامنے آ گئی۔ ماہرین لسانیات نے اُردو کی ابتداء کے واقعے کو برصغیر میں آریاؤں کی آمد سے جوڑا ہے۔ اُردو کے حوالے سے شرف الدین اصلاحی لکھتے ہیں:

> ''آریوں کا جو قبیلہ یا گروہ سندھ میں آباد ہوا، اس کی زبان تغیر وتبدل سے دوچار ہوتی ہوئی موجودہ سندھی کی شکل میں ہم تک پہنچی اور جو قبیلہ مدھیہ پردیش (Midland) میں سکونت پذیر ہوا اس کی زبان سے اُردو نکلی۔''(۹)

اُردو زبان نے مختلف زبانوں کے خزانہ علمی سے اکتساب فیض کیا ہے اور یہ سلسلہ ایک دوروز میں مکمل نہیں ہو گیا بلکہ اس کام میں کئی صدیاں صرف ہو چکی ہیں۔ تب کہیں جا کر اُردو زبان میں مختلف زبانوں کے دخیل الفاظ معنوی و اصطلاحی ہم آہنگی پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اُردو کی نشو ونما اور ارتقا میں جن تین بڑی زبانوں کا اہم کردار رہا ہے۔ وہ عربی، فارسی اور ہندی ہیں۔ برصغیر کے مسلمان شروع ہی سے عربی اور فارسی زبانوں سے وابستہ رہے ہیں۔ اسلامی تہذیب و ثقافت نے مسلمانوں کی دلچسپی کا محور عربی اور فارسی کو رکھا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد ایک نئے لسانی موڑ کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ جس کی وجہ سے برصغیر کی زبانیں ایک نئے انقلاب سے دوچار ہوئیں۔ جس کے نتیجے میں ایک نئے لسانی عہد کا آغاز ہوا۔ اس نئے لسانی دھارے نے برصغیر کے مختلف علاقوں اور ان علاقوں میں بسنے والی مختلف النوع ثقافت رکھنے والی قوموں کے لئے رابطے کی ایک مشترک زبان کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔

عربی اور فارسی زبانوں سے مذہبی اور تہذیبی و ثقافتی دلچسپی کے باوجود مسلمانوں کی روزمرہ زبان کا تعلق ہندی سے تھا۔ لہٰذا اب ضروری تھا کہ زبان اُردو کے لئے ایسا رسم الخط وضع کیا جائے یا اپنایا جائے جس میں نہ صرف عربی، فارسی اور ہندی زبانوں کے الفاظ بآسانی سموئے جا سکتے ہوں بلکہ دوسری زبانوں کے الفاظ بھی اس میں بغیر کسی دقت کے شامل کیے جا سکتے ہوں۔ لہٰذا اس مقصد کے لئے عربی رسم الخط کو اردو زبان کے لئے منتخب کیا گیا مگر یہ رسم الخط جوں کا توں لینے کی بجائے اس میں کچھ تبدیلیاں بھی ضروری تھیں کیونکہ عربی کے علاوہ دوسری زبانوں کے الفاظ کو بھی اس میں کھپانا تھا۔ پروفیسر سید محمد سلیم لکھتے ہیں:

> ''ڈھانچے اور ساخت کے اعتبار سے اُردو زبان دراصل ہندی ہے۔ اس کے بنیادی الفاظ کا ذخیرہ ہندی الفاظ پر مشتمل ہے اس لیے ہندی کی مخصوص آوازوں کے لئے عربی خط میں گنجائش پیدا کرنا ضروری تھا۔''(۱۰)

عربی فارسی اور ہندی کے علاوہ اُردو زبان میں انگریزی، ترکی، پرتگالی، لاطینی،

یونانی وغیرہ کے الفاظ بھی بکثرت موجود ہیں لہٰذا لسانیات کی رُو سے عربی رسم الخط سے ماخوذ فارسی رسم الخط ان تمام خصوصیات اور ترجیحات پر پورا اُترتا تھا جو کہ اُردو رسم الخط کے لئے ضروری تھیں۔ اس رسم الخط میں ہم تمام زبانوں کے الفاظ کو بڑی آسانی کے ساتھ سمو سکتے ہیں جبکہ ناگری اور رومن رسم الخط میں ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ ناگری اور رومن رسم الخط میں بہت سی آوازوں کے لئے حروف اور الفاظ کی ترجمانی پیچیدگی کا باعث تھی اسی لیے اُردو زبان کے لیے جو رسم الخط چنا گیا وہ اس کی نہ صرف تاریخی، مذہبی، ثقافتی و تہذیبی ضروریات کے مطابق تھا بلکہ لسانیاتی طور پر بھی مناسب اور آسان فہم تھا۔ اس رسم الخط میں روانی، تسلسل اور توازن و تناسب پایا جاتا ہے۔ اس رسم الخط میں مختلف حروف کی لکیریں، گولائیاں اور خمدار خطوط تحریر کو خوبصورتی اور دلکشی کا جامہ زیبا عطا کرتے ہیں۔

اُردو رسم الخط کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ نہایت خوبصورتی کے ساتھ داخل کیے جاسکتے ہیں۔ اس رسم الخط میں خوش نویسی اور خطاطی (Calligraphy) کے اعلیٰ نمونے پیش کیے جاسکتے ہیں اُردو رسم الخط ایک منفرد اور پُروقار تہذیبی و ثقافتی مزاج اور شاندار روایات کا آئینہ دار رہا ہے پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ:

> ''زبان، رسم الخط اور ادبی سرمایہ کے اعتبار سے اُردو قطعاً آزاد حیثیت کی مالک اور بلند مقام پر فائز ہے اس کی طبعی نشوونما اور تہذیبی ساخت پرداخت میں ہندوستانی تمدن کے مشترک، دلکش اور گراں بہا عناصر کے ساتھ، عرب و عجم کی شنگرف کاری کی بڑی مبارک اور واضح جھلک ملتی ہے۔''(۱۱)

زبان اور لسانیات کا سلسلہ مستقل تبدیلیوں اور تغیرات کے عمل سے گزرتا رہتا ہے اس سلسلہ میں وقت کے ساتھ ساتھ جدید تقاضوں کے ہم آہنگ نئے نئے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لئے مسلسل کام کرنا پڑتا ہے نئی نئی ایجادات اور علوم وفنون کا احاطہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ زبان کی تراش خراش کا عمل جاری رکھا جائے اور زبان کی زیبائش، آراستگی اور خوش وضعی

(Finery) کے لئے مناسب اقدام کیے جائیں اوراس کے قواعد وضوابط کو بار بار مرتب کیا جائے تاکہ لسانی ژولیدگی پیدا نہ ہوقواعد کی پابندی زبانوں میں ابتری (Irregularity) اور انتشار (Chaos) پیدا نہیں ہونے دیتی۔قواعد کی وجہ سے زبان میں باقاعدگی اور تنظیم، اسالیب میں جدت اور تنوع دیکھنے میں آتا ہے۔اگر زبانوں کی تراش خراش نہ کی جائے تو وہ جدید دور کے منشا کو پورا نہیں کرسکیں گی۔

لسانیات میں زبان اور رسم الخط کے ساتھ ساتھ املا (Orthography) کی بہت اہمیت ہے حروف اور الفاظ کی مروجہ شکل وصورت اور ساخت کو املا (Orthography) کا نام دیا جاتا ہے۔زبان میں فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ حروف اور الفاظ کونہایت تناسب اور خوبصورتی سے لکھا جائے۔رسم الخط اور املا کے حوالے سے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں لکھتے ہیں:

''املا دراصل لفظوں میں صحیح صحیح حرفوں کے استعمال کا نام ہےاور جوطریقہ ان حرفوں کے لئے اختیار کیا جاتا ہے وہ رسم خط کہلاتا ہے۔''(۱۲)

املا (Orthography) اور ہجے (Spelling) کوتحریر اور عبارت میں مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے اگر املا اور ہجے درست نہ ہوں تو عبارت تعبیر وتشریح کا فریضہ صحیح طور پرانجام دینے سے معذور ہوگی۔حقیقت یہ ہے کہ املا لفظوں کی صورت گری کا نام ہے زبان کی یک رنگی کوقائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ تمام الفاظ وحروف کے لکھنے کا طریقہ ہرجگہ اور ہر علاقے میں یکساں ہو۔اس مقصد کے لئے املا کے قواعد وضوابط کی پابندی کرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ املا میں بے ضابطگی دراصل تحریر کی درستی اور صحت کومتاثر کرتی ہے۔جس کا اثر زبان پر بھی پڑتا ہےلہٰذا ضروری ہے کہ املا کے مروجہ اُصولوں سے انحراف نہ کیا جائے۔

ہر زبان حروف کا ایک جامع نظام رکھتی ہے انھی حروف سے الفاظ اور الفاظ سے جملے اور فقرے ترتیب پاتے ہیں اور یہ جملے عبارت اور پیراگراف کوتشکیل دیتے ہیں ہر حرف کسی نہ کسی آواز کی نمائندگی کے لئے استعمال ہوتا ہے پروفیسر سید محمد سلیم لکھتے ہیں:

"تحریر کی ابتداء بتدریج ہوئی ہے پہلے انسان نے تفریح کے طور
پر تصویریں بنانی شروع کیں اس کے بعد خاکہ نگاری شروع کی اور اس کے
ذریعہ مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی۔ خاکہ نگاری سے بات نقوش تک جا پہنچی۔
اس سے مزید ترقی کر کے انسان کے حلق سے نکلنے والی آوازوں کے لئے
نقوش مقرر کر لیے۔"(۱۳)

انسان نے مختلف آوازوں کے لئے جو علامات اور نقوش اپنائے ان نقوش، علامات اور نشانات کو حروف ابجد (Abecedary) کہتے ہیں۔ انھی کو ہم حروف الف با (Alphabet) بھی کہتے ہیں۔ یہ حروف الف با تحریر کے لئے ابتدائی اکائیوں کی حیثیت رکھتے ہیں تحریر کا پورا نظام انھی حروفِ ابجد سے ترتیب پاتا ہے۔

کوشش کی جاتی ہے کہ تمام آوازوں کے لئے حروف کا مکمل اور ہمہ گیر قسم کا نظام ترتیب دیا جائے۔ تمام آوازوں کی حروف کے ذریعے ترجمانی کرنا نہایت دشوار اور نازک کام ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اُردو املا، اُردو زبان کی صوتی ضروریات اور جدید لسانی تقاضوں پر پورا اُترتی ہے اُردو املا کی اصلاح اور درستی کے لئے ہر دور میں ماہرین لسانیات مسلسل کام نہ کرتے تو اُردو زبان، رسم الخط اور املا کی موجودہ تسلی بخش اور ترقی یافتہ صورتِ حال بعید از قیاس (Paradoxical) ہوتی۔ اگر ہم اُردو کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو مختلف ادوار میں اُردو کے مختلف الفاظ کی املا میں اختلاف دیکھنے میں آتا ہے۔ جس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اُردو املا بھی اُردو زبان کی طرح بتدریج ارتقا اور ترقی کی منازل طے کرتی رہی ہے۔ بیسویں صدی میں جب ٹائپ اختیار کرنے کا مسئلہ سامنے آیا تو ماہرین لسانیات نے اُردو املا میں تبدیلیوں اور اصلاح کے لئے تجاویز مرتب کرنے کا بیڑہ اُٹھایا۔ جس کی وجہ سے اُردو املا کو ٹائپ کی چھپائی کے لیے موزوں بنانے کا کام شروع ہوا اور نتیجتاً آج کل اُردو کیلئے جو ٹائپ استعمال ہو رہا ہے وہ نہ صرف موزوں ہے بلکہ دیدہ زیب بھی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عتیق احمد صدیقی، ''رسم الخط اور زبان کا تعلق''، مشمولہ اُردو رسم الخط، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء، ص ۳۷۵۔

۲۔ خلیل صدیقی، ''زبان کیا ہے؟'' بیکن بکس، ملتان، ۱۹۸۹ء، ص ۱۸۔

۳۔ انیس ناگی: شعری لسانیات، کتابیات لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۱۰

۴۔ خلیل صدیقی، ''زبان کیا ہے؟'' ص ۸۶۔

۵۔ محمد ساجد خاکوانی، ''اُردو زبان پس منظر و پیش منظر''، ماہنامہ قومی زبان، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۵۸۔

۶۔ قدرت نقوی، سید ''لسانی مقالات (حصہ اوّل)''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء، ص ۱۵۔

۷۔ محمد صدیق شبلی، ڈاکٹر'' اُردو رسم الخط کا تحفظ، ماہنامہ اخبارِ اُردو''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، مئی ۲۰۰۰ ص ۴۔

۸۔ شبیر علی کاظمی، سید، ''پراچین اُردو''، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص ۱۷۔

۹۔ شرف الدین اصلاحی، ''اُردو سندھی کے لسانی روابط''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء، ص ۶۴۔

۱۰۔ محمد سلیم سید، پروفیسر، ''اُردو رسم الخط''، مقتدرہ قومی زبان، کراچی، ۱۹۸۱ء، ص ۴۱۔

۱۱۔ رشید احمد صدیقی، پروفیسر، '' کچھ اُردو رسم الخط کے بارے میں''، مشمولہ اُردو رسم الخط، ص ۳۹۱۔

۱۲۔ غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر'' اُردو املا کی تاریخ''، مشمولہ: منتخب مقالات اُردو املا و رموز اوقاف، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص ۱۳۔

۱۳۔ محمد سلیم سید، پروفیسر، ''اُردو رسم الخط''، ص ۱۳۔

لسانیات: تعریف اور شاخیں

اردو میں زبان کے علم کو لسانیات کا نام دیا گیا ہے۔ زبان سے متعلق کسی مسئلہ کو مدنظر رکھتے ہوئے احتیاط کے ساتھ ایک منظّم و مربوط انداز میں زبان کے سائنسی مطالعہ کو لسانیات کہا جاتا ہے۔ لسانیات زبان کی تراش خراش اور اس کی ترویج و فروغ اور ترقی میں نہایت معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ ایک ماہر لسانیات کا کام زبان کے مختلف پہلوؤں کا مختلف زاویوں سے مطالعہ کرنا ہی نہیں ہے بلکہ پرت در پرت زبان کے اندر اتر کر اس کی ساخت اور بناوٹ کو کھوجنا بھی ہے۔ بقول ڈاکٹر حامد اللہ ندوی:

> ''زبان کے مختلف پہلوؤں کا فنی مطالعہ لسانیات کہلاتا ہے زبان کا یہ فنی مطالعہ دوزمانی (Diochronic) بھی ہو سکتا ہے اور ایک زمانی بھی (Synchronic)۔ دوزمانی مطالعے کی حیثیت تاریخی ہوتی ہے جس میں کسی زبان کی عہد بہ عہد ترقی یا مختلف ادوار میں اس کی نشو ونما کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور ایک زمانی مطالعہ کی حیثیت توضیحی ہوتی ہے جس میں ایک خاص وقت یا خاص جگہ میں ایک زبان جس طرح بولی جاتی ہے اس کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔''(۱)

لسانیات نے زبان کی ماہیت کے شعور کو عام کیا ہے۔لسانیات نے زبان کو قصہ کہانیوں کی فرضی دنیا سے نکال کر اسے سائنس کی معروضی روشنی میں پیش کیا ہے۔اور اس کی اصل سے پردہ اٹھایا ہے۔

شان الحق حقی نے لفظ لسانیات انسانی بولیوں کے تحقیقی وتقابلی مطالعہ کے لیے استعمال کیا ہے۔(۲) جبکہ فیروز اللغات میں اس کے درج ذیل معنی درج ہیں:

لسانیات: زبان کی ابتدا،ارتقا اور اس کی تشکیل کے قانون کا علم،زبان کی تاریخ کا علم (۳)

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی لسانیات کی ذیل میں لکھتے ہیں:

''لسانیات (Linguistics) کا اردو ترجمہ ہے فلالوجی (Philology) کی اصطلاح بھی لسانیات کے مترادف کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہے۔لیکن فلالوجی ایک نسبتاً وسیع تر اصطلاح ہے جس کے مفہوم میں زبان کے سائنسی مطالعہ کے علاوہ ادبیات کا سائنسی مطالعہ بھی شامل ہے۔''(۴)

لسانیات مختلف زبانوں کی تاریخ،ارتقا،زبانوں کے آپس میں رشتے،معنوی وظاہری ساخت سے بحث کرتی ہے اور زبانوں کا عصری مطالعہ اور تجزیہ بھی کرتی ہے۔لسانیات کی تعریف کے حوالے سے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور لکھتے ہیں:

''لسانیات اس علم کو کہتے ہیں جس کے ذریعے سے زبان کی ماہیت،تشکیل،ارتقا،زندگی اور موت کے متعلق آگاہی ہوتی ہے۔''(۵)

لسانیات کی رو سے زبان ایک ایسے خود اختیاری اور روایتی صوتی علامتوں کے نظام کو کہتے ہیں جو کوئی انسان اپنے سماج میں اظہارِ خیال کے لیے استعمال کرتا ہے۔زبان اصوات کا مجموعہ اور ترتیب ہے۔لسانیات میں انسان کے اعضائے تکلم سے ادا کی جانے والی آوازیں ہی اہم ہیں۔اشاروں کی زبان یا تحریر لسانیات میں مرکزی اہمیت نہیں رکھتے۔انسان کے منہ سے ادا ہونے والے کلمات کا لسانیات میں مطالعہ کیا جاتا ہے۔لسانیات میں زبان کلمات کے

مطالعہ کو بمقابلہ تحریر کے زیادہ اہمیت اس لیے دی جاتی ہے کہ بولی پہلے پیدا ہوئی جب کہ تحریر بعد میں۔ بچہ سب سے پہلے بولنا سیکھتا ہے لکھنا بعد میں۔[6] Langue زبان کا وہ نظام ہے جو نظروں سے اوجھل رہتا ہے جب کہ Parole وہ کلام یا گفتار ہے جو زبان کے نظام پر قائم ہوتی ہے۔ جب ہم بات چیت کر رہے ہوتے ہیں تو اس گرائمر کے مطابق کرتے ہیں جو کہ نظر نہیں آتی۔ انسان کا بات چیت کرنا فطری عمل نہیں بلکہ اس کا فطری عمل وہ صلاحیت ہے جس کے مطابق وہ اس نظام کو وجود میں لاتا ہے۔ زبان لسانی صلاحیت کا نام ہے جب کہ گفتار اس صلاحیت کے اظہار کی صورت ہے۔ زبان محض ایک نظام نہیں جس کے مطابق جملوں کی تشکیل ہوتی ہے بلکہ وہ تو ایک نظام ہے جس کے اندر جملوں کی تشکیل کے قواعد کا علم بھی مضمر ہوتا ہے۔ زبان (Langue) ایک جامع تجریدی نظام اور گفتار (Parole) اس کی محدود انفرادی شکل ہے جو بولنے والے کی نطق (Speech) میں ظاہر ہوتی ہے۔[7]

زبان فکر کی ان صوتی علامتوں سے ترکیب پاتی ہے جو ایک مکمل نظام کے اجزا ہونے کے ساتھ ساتھ جداگانہ اور خود مختار حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں سے ہر علامت یا کلمہ ایک خاص غرض سے تخلیق کیا جاتا ہے اور اپنی صلاحیت اور استعمال کے اعتبار سے حک و اصلاح، تراش خراش اور ترک و اختیار کی منزلوں سے گزرتا رہتا ہے کم و بیش ہر لفظ کی ایک تاریخ ہوتی ہے جس کے دھندلکے میں گوناں گوں لسانی تغیرات کو ڈھونڈا جا سکتا ہے۔[8] گفتگو میں بہت سی ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو تحریر میں ظاہر نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً انداز گفتگو، دھیمی یا اونچی آواز، بولنے والے کا لہجہ، گفتگو کی نوعیت، تلفظ، ادائیگی، بولتے ہوئے اس کے جذبات: خوشی۔ غم۔ حیرت۔ خوف۔ ڈر شرمندگی۔ پشیمانی وغیرہ۔

لسانیات ایک سائنس کا درجہ رکھتی ہے کیوں کہ لسانیات میں زبان کا مشاہدہ کیا جاتا ہے جو کچھ انسان واقعی بولتا ہے صرف اسی کا مطالعہ کیا جاتا ہے نہ کہ اس بات کا کہ کسی کو کیسے بولنا چاہیے۔ لسانیات میں عارضی نتائج کی تصدیق کی جاتی ہے۔ یہاں تجربہ گاہ دو طرح کی ہو سکتی ہے ایک کوئی باقاعدہ تجربہ گاہ جیسے فونیٹیک لیب یا لنگویج لیب۔ دوسرے کوئی بھی مخصوص

لسانی گروہ (Speech Community) جہاں لوگوں کو واقعتاً بولتے ہوئے سنا جائے۔[۹]

جیسے گلکرسٹ نے اردو زبان سے زیادہ واقفیت اور اس میں مکمل دستگاہ حاصل کرنے کی غرض سے ۱۷۸۵ء کے شروع میں طویل رخصت لی۔ اپریل ۱۷۸۵ء میں فیض آباد پہنچے اور ہندوستانیوں کی معاشرت اختیار کر کے اردو زبان کی تحصیل اور تحقیق میں منہمک ہو گئے۔ اس سلسلے میں دہلی، بنارس اور لکھنؤ کا دورہ کیا اور پنڈتوں اور منشیوں کی مدد سے زبان کے پیچیدہ مسائل حل کرنے کی کوشش کی۔ زبان اور تحقیق کے ساتھ ان کی دلچسپی کا یہ نتیجہ نکلا کہ مشرقی زبانوں خاص کر اردو سے ان کی وابستگی گہری ہو گئی۔[۱۰]

لسانیات کا انسان، انسانی زندگی اور انسانی زبان و ادب کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ لسانیات کی مدد سے قدیم سے قدیم اور جدید سے جدید تر ادب کی تفہیم و تشریح میں آسانی ہو جاتی ہے اس کی مدد سے ہم کسی زبان کی قواعد اور اس میں موجود دوسری زبانوں کے الفاظ و تراکیب کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ لسانیات زبان اور تاریخ کے ان گوشوں کو بے نقاب کرتی ہے جو وقت کی دھند میں گم ہو چکے ہوتے ہیں۔ یہ مختلف زبانوں، انسانوں اور انسانی معاشروں کے درمیان پائے جانے والے تعلق اور باہمی رشتوں کی بازیافت کا کارنامہ سرانجام دیتی ہے۔ لسانیات سماجیات کو کئی پہلوؤں سے اجاگر کرتی ہے۔ آج کے دور میں جب خاندان ٹوٹ رہے ہیں گھرانے بکھر رہے ہیں اتفاق و اتحاد کے عناصر مفقود ہوتے جا رہے ہیں، لسانیات تعصّبات، قومیت اور وطنیت سے قطع نظر براعظموں، خطوں، ملکوں، شہروں میں بٹے ہوئے لوگوں کو مشترک لسانی خصوصیات کی بنا پر نزدیک لانے کے اسباب پیدا کرتی ہے۔

لسانیات کے مختلف نام

فرانس میں کارڈنل رِشلو (Richelieu) (1585ء تا 1642ء) نے 1635ء میں فرنچ اکیڈمی قائم کی جس کا مقصد فرنچ زبان کی تمام جزئیات کو ضابطے اور سلیقے کے سانچے میں محصور کرنا تھا۔ فرانس میں سترھویں صدی میں بالائی متوسط طبقے کے افراد خاص زبان کے ماہرین کی خدمات حاصل کرتے تھے تاکہ وہ انھیں اکیڈمی کی ٹیکسالی زبان سکھا سکیں۔ ہر طبقہ

اپنے سے برتر طبقے کی نقل کرتا تھا۔ اٹھارہویں صدی میں برطانیہ میں بالاتر طبقے میں شمولیت کے لیے لوگ قواعد جاننے والے اساتذہ سے تقریر و تحریر کا درس لیتے تھے۔ انیسویں صدی میں زبان کی صحت اور استناد کا یہ رویہ امریکہ بھی جا پہنچا۔[11]

ڈیویز نے ۱۷۱۶ء میں علم زبان کو گلاسولوجی (Glossology) کا نام دیا۔ قدیم زمانے میں لسانیات کو قواعد کے مماثل سمجھا جاتا تھا اس لیے اسے کوئی علیحدہ نام نہیں دیا جاتا تھا مگر جب ہند یورپی زبانوں کا آپس میں تقابلی موازنہ اور تجزیہ کیا گیا تو اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں کا نام تقابلی قواعد رکھا گیا۔ مگر جب یہ معلوم ہوا کہ علم زبان محض قواعد (صرف ونحو) ہی نہیں بلکہ اس میں مختلف آوازوں (صوتیات) اور معنیات کا بھی احاطہ کیا جاتا ہے تو انیسویں صدی میں اس کا نام تقابلی فلالوجی (Comparative Philology) رکھا گیا۔ Philo کے معنی ہیں محبت اور Logy کے معنی لفظ، علم وغیرہ۔ فلالوجی کے معنی زبان کی محبت۔ یعنی وہ علم جس میں زبان کے حوالے سے کام کیا جائے۔ اس کے بعد کچھ لوگوں نے اعتراض کیا کہ سائنس میں تقابل تو ہوتا ہی ہے اس لیے لفظ تقابل (Comparative) کی کیا ضرورت ہے۔ اس طرح علم زبان کو محض فلالوجی کہا جانے لگا۔ ۱۸۴۱ء میں پر چرڈ نے اسے گلاٹولوجی (Glottology) کا نام دیا۔ لیکن یہ نام علم زبان کے لیے رائج نہ ہو سکا۔ فلالوجی اس لیے قابل اعتراض تھا کہ اس کے دائرہ کار میں ادبیات اور اسلوبیات وغیرہ آجاتے ہیں۔ انیسویں صدی میں فرانس میں اس سے بہتر اصطلاح استعمال کرنے کی کوشش کی گئی یوں علم زبان کا نام Linguistique رائج ہو گیا۔ لنگئس ٹک لاطینی لفظ ہے جبکہ فلالوجی یونانی۔ Linguia زبان کو کہتے ہیں اور لنگئس ٹک زبان کے علم کو۔ انگریزی میں انیسویں صدی کے دوران علم زبان کے لیے Linguistic کا لفظ استعمال ہونے لگا جو چند سالوں کے بعد جمع کی صورت میں Linguistiqics کے نام سے مقبول ہوا۔ اور اب لسانیات کے لیے یہی لفظ رائج ہو چکا ہے۔ اردو میں اس کے لیے متبادل لفظ علم زبان یا لسانیات استعمال کیا جاتا ہے۔ اردو میں دوسرے علوم اسلامیات، دینیات، معاشیات،

نفسیات، سیاسیات، بشریات وغیرہ کی ساخت کو مدنظر رکھتے ہوئے لفظ لسانیات اس کے لیے زیادہ مقبول ہے جو کہ علم زبان کی نسبت مختصر بھی ہے۔ ڈینش (ڈنمارکی) اسکول لسانیات نے علم زبان کو Glossematics کا نام دیا۔[۱۲]

لسانیات کی تاریخ۔ ابتدا اور ارتقا

زبان ایک ایسی عجیب وغریب صلاحیت ہے جو انسان کی پیدائش سے موت تک اس کے ساتھ ساتھ رہتی ہے اسے تنہا ہوتے ہوئے بھی تنہائی کا احساس نہیں ہونے دیتی۔ مختلف ادوار کے حوالے سے زبان کے بارے میں مختلف آراء پائی جاتی ہیں، ماہرین زبان اور اہلِ فکر و دانش نے اس کے بارے میں مختلف تاویلیں پیش کی ہیں۔ زبان کو مافوق الفطرت عناصر کے ساتھ منسوب کیا جاتا رہا کبھی اسے عطیہ خداوندی کہا گیا اور کبھی مختلف دیویوں اور دیوتاؤں کی دین سمجھا جاتا رہا۔ دنیا کی قدیم ترین کتاب رگ وید، عہد نامہ عتیق کے علاوہ سقراط و افلاطون کے ہاں بھی زبان کے بارے میں کچھ نہ کچھ بات ضرور ملتی ہے۔

عین الحق کوٹ فریدی لسانیات کی ابتدا کے حوالے سے لکھتے ہیں ''زبان کی ابتدا کا مسئلہ ہمیشہ انسان کی دلچسپی کا مرکز رہا ہے۔۔۔کہیں اسے منرواکے نام سے منسوب کیا تو کہیں سرسوتی، ایتھا اور ثوث کو اس کا خالق قرار دیا لیکن جب ہم دنیا کی قدیم ترین کتاب رگ وید میں ''واک'' (بمعنی لفظ) کے عنوان سے دیے ہوئے ایک نغمۂ حمد کا مطالعہ کرتے ہیں تو اسے موجودہ لسانیات کے نظریوں سے کافی حد تک منطبق پا کر حیران رہ جاتے ہیں۔ اس نغمہ میں مرقوم ہے:

> ''جب ازمنہ قدیم میں روشن ضمیر مہارشی بہسپتی نے منہ سے پہلے پہل نکلنے والی آوازوں کو الفاظ کی شکل دی تو وہ پاکیزہ جذبات جنھیں انسان عرصے سے اپنے دل کی گہرائیوں میں چھپائے ہوئے تھا (سب پر) ظاہر ہوگئے۔''
>
> ''دانشوروں نے سوچ سمجھ سے کام لے کر الفاظ کو سنوارا اور

جس طرح سے غلے کو چھلنی میں ڈال کر چھانا جاتا ہے۔انھیں چھانٹ کر
(فضولیات سے) علیحدہ کیا۔''

انھوں نے الفاظ کی تلاش میں بڑی جانفشانی سے کام لیا اور
انھیں دوردراز بسنے والے رشیوں منیوں سے حاصل کر کے اکٹھا کیا، پھر
انھیں اکناف عالم میں ہر طرف بکھیر دیا اور سات مغنیوں نے مل کر انھیں
گیتوں کی شکل میں گایا۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ:

ایک آدمی تو بیٹھا ہوا شعروں کے حسین پھول بکھیر رہا ہے، دوسرا
ہے کہ میٹھی دھنوں میں ایک نغمہ الاپ رہا ہے، تیسرا بطور ایک برہمن کے اس
عالم موجودات کے قانون بیان کر رہا ہے اور چوتھا مقدس قربانی کے حصوں
کے لیے پیمانے مقرر کر رہا ہے۔''

مذکورہ بالا اقتباس میں مہارشی بہسپتی ایک ایسی ہستی کے طور پر سامنے آتا ہے جس
نے اپنے دور میں استعمال ہونے والے الفاظ کی تراش خراش کی۔

عہد نامہ عتیق

زبان کی ابتدا کے بارے میں عہد نامہ عتیق میں درج ذیل الفاظ آتے ہیں:

''اور خداوند خدا نے کل دشتی جانور اور ہوا کے کل پرندے مٹی
سے بنائے اور ان کو آدم کے پاس لایا کہ دیکھے کہ وہ ان کے کیا نام رکھتا ہے
اور آدم نے جس جانور کو جو کہا وہی اس کا نام ٹھیرا۔'' (کتاب پیدائش)

یعنی وہ آدم ہی تھا جس نے سب سے پہلے مختلف چیزوں اور جانوروں کے نام
رکھے۔لیکن لوگوں نے اس حقیقت کو توڑ مروڑ کے پیش کیا اور زبان، الفاظ یا ناموں کو براہ
راست خدا سے منسوب کر دیا۔

فلاطو کی رائے میں:

''یونانی فلاسفر فلاطو (۴۲۷ تا ۳۴۷ ق م) زبان کے بارے میں

اپنی تصنیف کریٹیلس (Cratylus) میں لکھتا ہے ''آخر زبان کے اولین الفاظ کس طرح وضع کیے گئے ہوں گیا ور وہ کون سے اصول وضوابط تھے جنھوں نے الفاظ کی تشکیل کے عمل میں رہنمائی کی۔''

فلاطو غیر ملکی زبانوں سے ناواقفیت کی بنا پر اس حوالے سے زبان کی پیدائش سے متعلق محرکات کا سراغ نگانے سے قاصر رہا۔[۱۳]

لسانیات کی تاریخ کے حوالے سے افلاطون کے بارے میں یونیورسٹی آف آکسفورڈ میں لینگو یج اینڈ کمیونیکیشن کے پروفیسر جین ایچی سن (Jean Aitchison) لکھتے ہیں:

> "Before the 19th century, Language in the western world was of interest mainly to philosophers. It is significant that the Greek philosophers Plato and Aristotle made major contributions to the study of language. Plato, for example, is said to have beenthe first personto distinguish between nouns and verbs."[14]

سنسکرت کے ادبی اور اونچے حلقے میں بول چال کی زبان ہونے کا ثبوت سنسکرت کے قدیم ترین قواعد نویس یاسکا (مصنف نروکتا) کے یہاں ملتا ہے جو اس زبان کو بھاشا کے نام سے یاد کرتا ہے جس کے معنی بولی جانے والی زبان ہے۔ وہ اس زبان اور ویدوں کی زبان میں امتیاز کرتا ہے۔ اس کے بعد پانی بھی ویدک سنسکرت اور ادبی سنسکرت میں فرق بیان کرتا ہے۔ پانی نے (۳۳۰ ق۔م) میں زندہ زبان کی قواعد لکھی تھی۔ وہ لاہور میں پیدا ہوا اور ٹیکسلا میں تعلیم پائی یہ مقامات آریائی تمدن کے گھوارے تھے جہاں کی زبان پوربی کے برعکس ویدوں کی زبان سے زیادہ قریب تھی۔ پانی کی قواعد مسلمہ طور پر مدھ پردیش اور پورب کے علاقوں میں معیاری کتاب کی حیثیت سے رائج تھی۔[۱۵]

اٹھارویں صدی عیسوی میں یہ خیال زور پکڑ رہا تھا کہ زبان کی ابتدا کسی مافوق الفطرت طریقہ سے شروع ہوئی ہے۔ اس حوالے سے مشہور انقلابی انشاء پرداز روسو (Rousseau)

(۱۷۱۲ء۔۱۷۷۲ء) کی تصنیف ''زبانوں کی ابتداء) خاص اہمیت رکھتی ہے۔اس میں ایک طرف تو زبانوں کے مافوق الفطرت مآخذ کی تائید کی گئی ہے اور ساتھ ہی زبانوں کو کچھ قدرتی امور کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔(۱۶) شکیل الرحمٰن لکھتے ہیں:

''شروع میں ڈیموکریٹس (Democritus) نے کہا تھا کہ زبان انسان کی تخلیق لیکن آواز اور الفاظ کا ان چیزوں سے تعلق برائے نام ہے۔جن چیزوں کی طرف انسان آواز یا الفاظ سے اشارہ کرتا ہے اپی کیورس (Epicurus) نے بتایا تھا کہ زبان کی تخلیق قدرتی ہے۔الفاظ قدرتی طور پر بن گئے ہیں اور بنتے رہیں گے۔انتہا اس وقت ہو جاتی ہے جب عیسائیت کے پھیلنے کے بعد زبان کو الہامی شے سمجھا جانے لگا۔ہے نے کہا تھا انیسویں صدی میں ال۔جی بونالڈ (L.G.Bonald) نے بتایا کہ آواز انسان کی تخلیق نہیں ہوسکتی زبان براہ راست خدا کی طرف سے انسان کے پاس آئی ہے۔آواز خدا کی زبان ہوتی ہے اور اچھے نئے الفاظ اور اچھی نئی آواز صرف انھیں نصیب ہوتی ہے جو خدا کے قریب ہوتے ہیں۔''(۱۷)

زبان سے متعلق سائنسی تحقیقات کا آغاز ۱۷۷۲ء میں کانٹ کے شاگرد اور گوئٹے کے دوست جاہن گاٹفرائیڈ ہرڈر (Johann Gottfried Herder) (۱۷۴۴ء تا ۱۸۰۴ء) کی مشہور تصنیف ''زبان کے ماخذ'' سے ہوا۔لسانیات میں ہرڈر کو اس لیے بھی اہمیت حاصل ہے کہ اس نے سب سے پہلے یہ بات کہی کہ زبان کسی مافوق الفطرت ہستی کا کارنامہ نہیں ہے بلکہ یہ اس قدر ناقص اور نامکمل ہے کہ اسے قادر مطلق سے منسوب کرنا اس کی شان کے منافی ہے۔زبان صرف اور صرف انسان کی ناقص کوششوں کا نتیجہ ہے۔(۱۸)

اٹھارویں اور انیسویں صدی کے دوران یورپ میں زبانوں کے تاریخی وتقابلی مطالعہ کو کافی فروغ حاصل ہوا۔اس مطالعے کی باقاعدہ بنیاد انگریز قانون دان سر ولیم جونز (Sir Willliam Jones) نے ۱۷۸۶ء میں ڈالی جو اس زمانے میں کلکتہ میں مقیم تھا۔جونز نے 'رایل ایشیاٹک سوسائٹی' کلکتہ کے زیر اہتمام منعقدہ ایک جلسے میں ۲۷ ستمبر ۱۷۸۶ء کو

ایک مقالہ پڑھا جس میں اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ سنسکرت (قدیم ہندوستانی زبان) یونانی، لاطینی، کلٹک اور جرمانک ان تمام زبانوں میں چونکا دینے والی لسانی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ جن کی وجہ سے جونز کو یہ نتیجہ اخذ کرنا پڑا کہ یہ زبانیں ضرور کسی ایک مشترک ماخذ سے ارتقا پذیر ہوئی ہیں۔ یہیں سے زبانوں کے تاریخی وتقابلی مطالعے کی باقاعدہ طور پر ابتدا ہوتی ہے۔[19]

سر ولیم جونز نے ۲۷ ستمبر ۱۷۸۶ء کو ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے تیسرے سالانہ اجلاس میں اپنے خطبہ صدارت کے دوران سنسکرت کے بارے میں فرمایا:

''سنسکرت بلالحاظ اپنی قدامت کے ایک عمدہ ہیئت کی زبان ہے۔ یہ یونانی سے زیادہ تکمیل یافتہ اور لاطینی سے زیادہ جامع ہے اور ان دونوں کی نسبت لطیف اور شائستہ ہے لیکن پھر بھی ان دونوں زبانوں سے بہت زیادہ مشابہت رکھتی ہے افعال کے مخارج اور صرف ونحو کے لحاظ سے یہ اتنی زیادہ ملتی جلتی ہیں کہ اسے محض ایک اتفاق کا نتیجہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اگر کوئی بھی محقق ان تینوں زبانوں کا بنظر غائر مطالعہ کرے تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان تینوں زبانوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے اگرچہ اب وہ سرچشمہ بذات خود معدوم ہو چکا ہے۔ نیز اس امر کے تسلیم کرنے کے لیے بھی کافی شواہد موجود ہیں کہ گاتھ قوم کی زبان اور سلیٹی زبان بھی اسی سرچشمہ سے پھوٹی ہیں اور پھر قدیم فارسی کو بھی اسی رشتہ میں منسلک کیا جاسکتا ہے۔''[20]

سر ولیم جونز عبرانی، یونانی، لاطینی، فرانسیسی، ہسپانوی، اطالوی، عربی، فارسی، جرمن وغیرہ کے علاوہ اور بھی کئی زبانیں جانتا تھا۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر معین الدین عقیل لکھتے ہیں:

''عام طور پر ہندیات کے مطالعہ کے ضمن میں ایشیاٹک سوسائٹی کو اولیت اور جونز کو بابائے ہندیات تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن اس امر کو کلی طور پر درست نہیں ماننا چاہیے۔ جہاں تک ہند یورپی زبانوں کی اصل کا تعلق ہے،

جونزاس کے اظہار میں پہلا شخص نہیں ہے۔ تھامس اسٹیونس، ایک جیسوٹ جو
۱۵۸۳ء میں ہندوستان آیا تھا اور فلپو سیسیٹی (Fillpo Sesseti) ایک
اطالوی تاجر جو گوا میں ۱۵۸۵ء میں پہنچا تھا، انفرادی طور پر سنسکرت کی قدیم
زبانوں کے مابین نسبتوں کو بیان کر چکے تھے۔ اسی طرح پانڈی چری کا ایک
جیسوٹ کورڈو جونز کی آمد سے قریباً بیس سال قبل یہی مشاہدہ کر چکا تھا۔
۱۷۶۸ء میں اس نے سنسکرت اور یورپ کی قدیم زبانوں کے مابین رشتوں
کو ظاہر کرنے کے لیے الفاظ اور افعال کی ایک طویل فہرست مرتب کی
تھی۔ قریب قریب اسی عہد میں ایک ولندیزی عالم مارکیوس زیوریوس
بوکسورن نے بھی ہندیورپی زبانوں کی اصل کو مشترک قرار دیا تھا۔ جونز کے
عہد میں پی ایس پلاس نے ۱۷۸۶ء۔۱۷۸۷ء میں یورپ اور ایشیا کی دوسو
زبانوں کا جائزہ لیا تھا۔''(۲۱)

فریڈرک شلیگل (Friedrich Schlegel) (۱۷۷۲ء تا ۱۸۲۹ء) نے
۱۸۰۸ء میں ایک کتاب ''اہل ہند کی زبان اور حکمت'' کے نام سے شائع کی جس میں ولیم جونز
کے تجویز کردہ خیال کے مطابق یورپی زبانوں کا سنسکرت سے تفصیلی موازنہ کیا گیا تھا۔ ان
زبانوں کے الفاظ اور صرف ونحو کی مماثلت کے مطالعہ کے بعد اس نے سنسکرت اور یورپی
زبانوں خاص کر یونانی، لاطینی اور جرمن کے مابین ایک گہرا رشتہ اور مطابقت کی نشاندہی
کی۔ یہی وہ پہلا شخص تھا جس نے سب سے پہلے تقابلی لسانیات کی اصطلاح وضع کی۔ باویریا
کے فرانز بوپ، اینگلو جرمن ماہر لسانیات میکس مولر، امریکن ماہر لسانیات ولیم وہنٹے، فرانس کے
ماہر لسانیات موسیوڈی کیمپلن، الفریڈ رسل والس، آئس لینڈ یونیورسٹی کے سابق چانسلر پروفیسر
الیگزینڈر جاہنسن نے زبان کے حوالے سے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔(۲۲)

انگریزی میں لغت نویسی کی ابتدا تیرھویں صدی عیسوی سے ہوتی ہے۔(۲۳)
اردو زبان اور اس کے لسانیاتی پہلوؤں سے اولین دلچسپی اہل یورپ کو پیدا ہوئی
جن میں ڈچ، پرتگالی، فرانسیسی، جرمن، اطالوی اور انگریز علما شامل تھے۔ جنھوں نے نہایت

شوق وانہماک کے ساتھ اردو کی قواعدیں مرتب کیں۔لغات ترتیب دیے اور اصول زبان سے متعلق کتابچے لکھے۔اس ضمن میں جوشوا کیٹلر، شلز، ہیڈ لے، ولیم ٹیٹ، گل کرسٹ، جان شیکسپیئر، گارساں دتاسی، جان ڈوسن، جان ٹی پلیٹس، ڈنکن فاربس، رچرڈسن اور ایس ڈبلیو فیلن وغیرہ کی خدمات نہایت قابلِ قدر ہیں۔(۲۴)

اردو زبان اس سلسلے میں اہل یورپ کی احسان مند ہے کہ اس کے اولین لغات مرتب کرنے کا سہرا ان کے سر ہے ورنہ اہل ہندوستان جو بزعم خود اہل زبان کہلاتے تھے اس مطالبے پر حیرت سے منہ تکتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ کبھی کسی نے قواعد ولغات کی مدد سے بھلا اپنی زبان سیکھی ہے۔(۲۵)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی تحقیق کے مطابق اردو زبان کی سب سے پہلی گرامر ایک ڈچ اردو شاعر نے تحریر کی تھی جس کا نام ''کیٹلر'' تھا یہ شخص ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ڈائریکٹر تھا۔ شاہ عالم (۱۷۰۸ء۔۱۷۱۲ء) اور جہاں دار شاہ کے دربار میں ڈچ سفیر کے طور پر حاضر ہوا تھا۔ اس نے ''صرف ونحو ہندوستانی'' کے نام سے اردو زبان کی گرامر ۱۷۰۱ء میں لکھی تھی۔(۲۶) اردو زبان کے حوالے سے کام کرنے والے مستشرقین میں جان گلکرسٹ، ایٹس، ولیم ٹیٹ، مونیر ولیمز، ہالرائیڈ، الٹوڈس پر یچرڈ، جی این رینکنگ، لفٹنٹ کرنل ڈی سی فلوٹ، پیرسن وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

اردو کی پہلی لغت پر بات کرتے ہوئے ایس کے حسینی اپنے مقالہ ''اردو لغت نویسی اور اہل انگلستان'' میں لکھتے ہیں:

> ''جارج ہیڈ لے (George Hadley) نے اردو صرف ونحو پر ایک کتاب ۱۷۷۳ء میں تالیف کی۔جس میں ہندوستانی لغت بھی شامل ہے۔ یہ انگریزی لغت نویسی کا پہلا خاکہ ہے۔یہ کتاب کافی مقبول ہوئی۔ اس کے بعد جے فرگوسن (J.Fergusson) نے ایک لغت ترتیب دی جس میں صرف ونحو کے لیے بھی ایک حصہ مختص کیا۔''(۲۷)

فرگیوسن کے بارے میں مولوی صاحب لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر گلکرائسٹ سے اول بھی ایک شخص فرگیوسن نامی نے اردو کی ایک لغت لکھی تھی، جو لندن میں ۱۷۷۳ء میں طبع ہوئی مگر چونکہ وہ بالکل ناکافی تھی، جنرل ولیم کرک پیاٹرک نے ایک ڈکشنری لکھنے کا ارادہ کیا جس کے انھوں نے تین حصے کیے مگر اس کا ایک ہی حصہ طبع ہونے پایا۔ اس حصے میں انھوں نے وہ الفاظ لیے ہیں جو عربی فارسی کے ہندی میں آگئے ہیں۔۔۔ یہ ایک حصہ لندن میں ۱۷۸۵ء میں طبع ہوا۔''[۲۸]

مستشرقین کی ان خدمات کا نتیجہ یہ تھا کہ اردو زبان میں لغت اور قواعد کا سرمایہ اتنا وافر ہو گیا کہ غیر ملکیوں کے لیے اردو زبان سیکھنا آسان ہو گیا۔[۲۹]

اردو میں ہم دیکھتے ہیں کہ دلی میں اور پھر لکھنؤ میں زیادہ شعرا اور ادبا کے علاوہ عام آدمیوں میں بھی زباندانی کا شعور پیدا ہو گیا تھا۔ انیس اور داغ اپنی زباندانی پر پھولے نہ سماتے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ علماء اور ادباء کے علاوہ عام لوگوں کی اکثریت بھی بہتر سے بہتر زبان بولنے اور سیکھنے کی تگ و دو میں رہی ہے۔ اور وہ بہتر زبان کے عملی استعمال کے لیے کوششیں کرتے رہے ہیں۔ نثر و نظم میں شستہ و مہذب اسلوب کی دریافت کرتے ہیں۔ وہ تلفظ، محاورہ اور روزمرہ کی صحت و عدم صحت کی بحث کرتے ہیں۔ لسانیات کا طالب علم بھی انھیں کی طرح زبان کا مطالعہ کرتا ہے۔[۳۰]

مولوی عبدالحق نے اردو زبان کی ترویج و اشاعت اور نشوونما کے حوالے سے نہایت گراں قدر تحقیقی و لسانی خدمات سرانجام دی ہیں۔ انھوں نے اردو زبان اور تحقیق کے ابتدائی نقوش اور خدوخال کو ابھارنے کے ساتھ ساتھ اسے درست سمت بھی عطا کی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''زبان کی ساخت و پیدائش، سوسائٹی اور زبان کے تعلق، زبان کی حیثیت، زبان اور ہمارا تہذیبی و ثقافتی سرمایہ، زبان اور قومی کردار اور اسی قسم کے بڑے مفید اور اہم موضوعات پر مولوی صاحب نے قلم اٹھایا ہے۔

زبان کے متعلق عموماً اور اردو زبان کے متعلق خصوصاً ان کی نظر بڑی گہری اور وسیع ہے۔ اردو کی پیدائش اور اس کے ارتقاء۔ اس کے ماخذ و مبداء، اس کے اصول و قواعد، اس کے عروج و زوال کے اسباب، اس کے مزاج کی ساخت اور خصوصیات سے کما حقہٗ واقفیت کے لیے ''خطبات عبدالحق'' کا مطالعہ ضروری ہے۔''(۳۱)

اردو لسانیات کے حوالے سے کام کرنے والوں میں حافظ محمود شیرانی (پنجاب میں اردو)، پروفیسر مسعود حسین خان (مقدمہ تاریخ زبان اردو ۱۹۸۷ء بار دوم، Current trends in Linguistics)، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور (ہندوستانی صوتیات، ہندوستانی لسانیات)، ڈاکٹر شوکت سبزواری (اردو زبان کا ارتقا ۱۹۵۶ء)، ڈاکٹر سہیل بخاری، ڈاکٹر گیان چند، سید سلیمان ندوی (نقوش سلیمانی ۱۹۳۹ء) نصیرالدین ہاشمی (دکن میں اردو)، آمنہ خاتون (دکنی کی ابتدا، ۱۹۷۰ء)، مرزا خلیل احمد بیگ (اردو کی لسانی تشکیل ۱۹۸۵ء، اردو زبان کی تاریخ)، سید حمید الدین قادری شرفی (ہند آریائی اور اردو ۱۹۸۶ء)، خورشید حمرا صدیقی (اردو زبان کا آغاز ۱۹۹۳ء)، سید احتشام حسین (اردو کی کہانی ۱۹۵۶ء، ہندوستانی لسانیات کا خاکہ ۱۹۴۸ء)، سجاد ظہیر (اردو، ہندی، ہندوستانی ۱۹۴۷ء)، امتیاز علی عرشی (اردو میں پشتو کا حصہ، ۱۹۶۰ء)، مہر عبدالحق (ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق ۱۹۵۷ء) شرف الدین اصلاحی (اردو اور سندھی کے روابط ۱۹۷۰ء) محمد یوسف بخاری (کشمیری اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

زبان کی دو شکلیں ہوتی ہیں: بول چال کی زبان اور تحریری زبان۔ اصل زبان بول چال کی زبان ہے اور تحریری زبان اساساً بول چال کی زبان ہی کی نمائندگی کرتی ہے کسی زبان کو پوری طرح جاننے کا مطلب ہے کہ ہم اس کی دونوں شکلوں کو جانتے اور انھیں استعمال کر سکتے ہیں۔ اس لیے کسی زبان کو پوری طرح جاننے کے لیے اس کی تمام مہارتیں حاصل کرنا ضروری ہیں۔ زبان کی بنیادی مہارتیں چار ہیں:

۱۔ سن کر سمجھنا

۲۔ بولنا

۳۔ پڑھنا

۴۔ لکھنا

جہاں تک مادری زبان کا تعلق ہے پہلی دو مہارتیں یعنی سن کر سمجھنا اور بولنا سیکھنا سب کے لیے یکساں طور پر آسان ہوتا ہے کیونکہ یہ دونوں مہارتیں بچوں کو کم وبیش چار سال کی عمر تک اپنے ماحول میں خود بخود آ جاتی ہیں۔ البتہ باقی دو مہارتوں یعنی پڑھنے اور لکھنے کو کوشش کر کے حاصل کیا جاتا ہے۔(۳۲)

زبان اپنے فریضہ کی انجام دہی میں آوازوں سے بنائے ہوئے نمونوں کے وسیلہ سے کام لیتی ہے۔ انسان سینکڑوں ایسی آوازیں پیدا کرسکتا ہے جنھیں انسانی کان باہم ممیّز کر سکتے ہیں۔ ہر زبان ان میں سے صرف چند ایک کو اپنے لیے منتخب کر لیتی ہے اور پھر ان کی ترکیب وترتیب سے ہزاروں الفاظ ومرکبات بنا لیتی ہے۔ ان الفاظ کے علاوہ ہر زبان کا بولنے والا اپنی جسمانی حرکات وسکنات کے ساتھ ساتھ آواز کے اتار چڑھاؤ کو بھی کام میں لاتا ہے۔ ہر زبان آوازوں کے وسیلے سے معرض وجود میں آئی۔ دوسرے وسیلے مثلاً نقوش، تصاویر اور حروف وغیرہ بعد میں استعمال ہونے لگے۔ مفرد آوازیں جنھیں صوتیات کی اصطلاح میں اصوات کہتے ہیں ہر زبان کے خودساختہ اصولوں کے مطابق ترتیب پا کر الفاظ کے قالب میں ڈھلتی ہیں جو باہم مل کر مرکبات جملوں اور فقروں کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ زبان محض اصوات کی ایک مالا کا نام نہیں بلکہ ان اصوات کے اس زبان کے قواعد کے مطابق ڈھلنے کے علاوہ اس زبان کی اختیار کردہ حرکات وسکنات اور آواز کے زیر وبم کی پابندی کے ساتھ ادا ہونے کا نام ہے۔ ہر شخص اپنی مادری زبان کے ان عناصر اور ان کے خواص ومطالب کو لاشعوری طور پر سیکھ لیتا اور برتتا ہے اور اس طرح وہ اپنی زبان کی مکمل صلاحیتوں سے کام لینے کے قابل ہو جاتا ہے۔ لیکن کسی اجنبی کو یہ سب کچھ شعوری طور پر سیکھنا پڑتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اسے نہ صرف

ابلاغ معنی میں دشواریاں پیش آتی ہیں بلکہ بعض اوقات وہ سنگین غلط فہمیوں کا شکار یا باعث بھی ہوسکتا ہے۔(۳۳)

لسانی مطالعے کی شاخیں

پہلی قسم :عام(General)اور اطلاقی (Applied)لسانیات

دوسری قسم:عصری لسانیات(Synchronic linguistics)یا عصری مطالعہ(زمانے کو مدنظر رکھ کر جو تقسیم کی گئی ہو)زبان کا مطالعہ اگر کسی مخصوص نقطہ زماں میں کیا جائے۔اگر یہ مطالعہ زمانے کے تسلسل میں کیا جائے تو اسے عصریاتی لسانیات (Diachronic Linguistic)یا عصریاتی مطالعہ کہا جاتا ہے۔

لسانیات کی شاخیں

توضیحی لسانیات

اگر ایک زبان کا عصری مطالعہ حال کے نقطے میں کیا جائے،ایک زبان کا ایک مخصوص نقطہ زماں میں مطالعہ کیا جائے تو اس صورت میں اس کی ساخت ہی کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔اسے Descriptiveیا Stenctuialلسانیات کہتے ہیں اسے توضیحی لسانیات کا نام دیا گیا ہے۔چونکہ توضیح Description کو نہیں Clarification کو کہتے ہیں اس لیے توضیحی یا بیانی سے بہتر اصطلاح ساختی یا تجزیاتی ہوسکتی ہے۔

تاریخی لسانیات

تاریخی لسانیات میں زبان کی تاریخ اور زبان میں عہد بہ عہد تبدیلیوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔تاکہ زبانوں کے ارتقا،ان کی اصل کے بارے میں معلومات اور زبانوں کی خصوصیات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔اس میں زبانوں کی رنگا رنگی کو بیان کیا جاتا ہے۔اس شاخ میں کسی بھی زبان کا مطالعہ ماضی میں اس کے قواعد اور اصوات کے مطالعہ پر مشتمل ہوتا ہے۔اس کے علاوہ کسی زبان کا عہد بہ عہد مطالعہ کیا جاتا ہے۔

تقابلی لسانیات

تقابلی لسانیات میں ایک ہی خاندان میں مختلف زبانوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔یہ زبانوں کے باہمی رشتے کے بارے میں روشنی ڈالتی ہے۔دنیا میں تقابلی لسانیات کا آغاز اس وقت ہوا جب ولیم جونز نے ۱۷۸۶ء میں اہل مغرب کو سنسکرت سے روشناس کرایا۔ہندیورپی خاندان کے حوالے سے تقابلی لسانیات کی ابتدا سراج الدین علی خاں آرزو (۱۶۸۹ء۔۱۷۵۶ء) کی کتاب ''نوادرالالفاظ'' سے ہوئی۔جس میں انھوں نے فارسی اور سنسکرت کا تقابل پیش کیا۔

نوعیات

نوعیات میں مختلف خاندانوں کی زبانوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

تجزیاتی لسانیات

تجزیاتی لسانیات میں صوتیات اور قواعد (صرف اور نحو) وغیرہ کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔اس شاخ میں زبان کے ڈھانچے،زبان میں تبدیلی اور ارتقا سے سروکار رکھا جاتا ہے۔

تجزیاتی لسانیات عام لسانیات کے تابع ہے۔اس میں زبان کی گزشتہ تاریخ کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔

اطلاقی لسانیات

عام لسانیات اور تجزیاتی لسانیات کا عملی پہلو ہے۔اس کے ذیل میں درج ذیل قسم کے پہلو آتے ہیں۔

بیرونی زبانوں کا سیکھنا۔ترجمے کی مشین بنانا۔کسی زبان یا بولی کا علاقائی جائزہ لینا،کسی زبان کی کوڈ تیار کرنا،کسی زبان کی خفیہ کوڈ دریافت کرنا۔رسم الخط میں اصلاح کی تجاویز ٹائپ رائٹر میں حروف کی ترتیب وغیرہ۔

عام لسانیات

لسانیات کے نظریات پیش کرتی ہے۔زبان کی ماہیت،زبان کے تجزیے کے

اصول، مروجہ قواعد سے اس کے اختلافات، لسانی مطالعے کے مختلف شعبوں کے اصول اوران کا عام تعارف شامل ہوتا ہے۔ انسانی زبانوں کے آفاقی خواص کی تلاش کی جاتی ہے۔

عام لسانیات میں تجزیاتی اور تاریخی لسانیات نیز مطالعہ زبان کے دوسرے تمام شعبوں کا تھوڑا تھوڑا سا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں اصولی پہلو کی زیادہ اہمیت ہوتی ہے مثلاً صوتیات کے اصول درج کر دیے جائیں۔ کسی ایک زبان کی صوتیات کا تجزیہ نہیں کیا جائے گا یہی کیفیت صرف ونحو، معنیات، فن تحریر وغیرہ کے سلسلے میں ہوگی۔(۴۴)

لسانی فردیات: Linguistics Ontogeny

آنٹوجینی میں اس بات کا مطالعہ کیا جاتا ہے کہ انسان شیرخوارگی سے لے کر زندگی کے آخری لمحہ تک زبان سے کس طرح اکتساب کرتا ہے اوراس کی زبان میں کیا کیا تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ یہ بائیالوجی (Biology) کی ایک شاخ ہے۔

لسانیات تیزی سے پھیلتا ہوا ایک علمی وحکمیاتی شعبہ ہے جس کی چند دوسری شاخیں درج ذیل ہیں:

سمعی صوتیات

سمعی صوتیات میں اصوات کی تخلیق اور ترسیل کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

آلیاتی صوتیات

آلیاتی صوتیات میں آلات کے ذریعے اصوات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

بیانیہ لسانیات

کسی خاص وقت پر زبان کی اس وقت کیفیت کا لسانیاتی تجزیہ اور بیان، بیانیہ لسانیات سے تعلق رکھتا ہے۔

بشریاتی لسانیات

اس کے لیے انسانیاتی لسانیات کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس شاخ میں زبان

وثقافت اوران کے باہمی تعامل کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔اس میں انسان کے ارتقا اوراس کے تہذیب وتمدن کا مشاہدہ ومطالعہ کیا جاتا ہے۔

عمرانی ثقافتی لسانیات

سماجی ڈھانچے،زبان کے تغیر اور زبان کے بارے میں رویوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔یہ عمرانی لسانیات کا وہ شعبہ ہے جس میں معاشرہ میں زبان اور عمرانی اور ثقافتی اکائیوں کے باہمی تعامل پر بحث کی جاتی ہے۔

نفسیاتی لسانیات

نفسیاتی لسانیات میں زبان سے متعلق نفسیاتی مسائل کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔یہ شاخ زبان سیکھنے اور یادرکھنے کے حوالے سے اہم ہے۔کسی کی تحریر یا الفاظ اور جملوں کے

اعصابی لسانیات

دماغ کا مطالعہ کہ وہ زبان کا حصول،ترسیل اور فہم کیسے کرتا ہے۔

لسانیاتی جغرافیہ

لسانیات کا یہ شعبہ زبان یا بولی کی جغرافیائی حد بندی کا تعین کرتا ہے۔

بولیات

اس شاخ میں بولیوں اوران سے وابستہ حقائق ومسائل کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

معنیات

معنیات میں زبان کے معانی اوران سے وابستہ حقائق کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

عملیتی معنیات

وہ شعبہ جو خیال کے لفظی یا علامتی اظہارات اور اظہار کنندہ کے باہمی تعلق سے بحث کرتا ہے۔

حصولِ زبان

یہ عملی لسانیات کا وہ شعبہ ہے جو اس امر کا مطالعہ کرتا ہے کہ بچہ اپنی مادری زبان اور بالغ کوئی اجنبی زبان کیسے سیکھتا ہے

تدریس زبان

یہ مادری اور اجنبی زبان سکھانے سے متعلق حقائق و مسائل سے بحث کرتا ہے۔

صوتیات

اصوات کی تخلیق، ترسیل اور ادراک کا مطالعہ، تجزیہ، حکمت اور زمرہ بندی۔

علم الاصوات

کسی خاص زبان کی اصوات اور ان کے باہمی ارتباط کا مطالعہ

قواعد

قواعد میں زبان کی ساخت اور اس کے عمومی قواعد اور اصول کی حکمت سے بحث کی جاتی ہے۔[۳۵]

لسانیات کی دیگر شاخیں درج ذیل ہیں:

نسلی لسانیات یا بشریاتی لسانیات

اس میں زبان کا مطالعہ انسان، نسل انسانی اور تہذیب کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔

- ☆ اعدادی لسانیات
- ☆ ریاضیاتی لسانیات

سماجی لسانیات

انسان اور سماج کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ زبان بھی اس تعلق میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس شاخ میں اس بات کا مطالعہ کیا جاتا ہے کہ سماج میں زبان کا کیا حصہ ہے۔ زبان سماج پر اور سماج زبان پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے۔

تجزیاتی لسانیات

صوتیات:(Phonetics)

اس میں ممکنہ تمام اصوات کوزیر بحث لایا جاتا ہے اس میں ایک زبان سے لے کر کئی اور تمام زبانوں کی اصوات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

فونیمیات:(Phonomics)یا(Phonology)

اس میں تمام زبانوں کی اصوات کا مطالعہ کرنے کی بجائے کسی ایک زبان کی صوتیات کوزیر بحث لاکراس کی اصوات میں اختلافات سے بدلتے ہوئے معانی کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

مارفیمیات یا صرف:(Morphology)

اس میں الفاظ کی ساخت اور بناوٹ کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور نئے الفاظ کے اشتقاق پر بحث کی جاتی ہے۔

نحو:(Syntex)

اس میں کلام یعنی جملوں اور فقروں، ان کی ترتیب اور قاعدوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔زبان کی قواعد کوصرف ونحو کہا جاتا ہے۔

معنیات:(Semantics)

اس میں لفظوں اور جملوں کے مفہوم سے بحث کی جاتی ہے۔تجزیاتی لسانیات میں مندرجہ بالا پہلی چار شاخوں کا ہی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ان میں فونیمیات ،صرف اور نحو کو مرکزی شاخیں قرار دیا جاتا ہے اور صوتیات اور معنیات کونواحی۔

جدید لسانیات میں صوتیات پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے اوراس کا مطالعہ بطور خاص کیا جاتا ہے۔یعنی صوتیات ہی اصل لسانیات ہے۔

مارفونیمیات:(Morpho-Phonemics)

بعض اوقات تصریف کے عمل میں الفاظ میں چند تبدیلیاں واقع ہو جاتی ہیں۔ان تبدیلیوں کو مارفونیمیات کہا جاتا ہے۔مثال کے طور پر خرید اور دار کو ملا کر "د" کو حذف کر کے مرکب خریدار بنایا جاتا ہے۔فونیمیات اور مارفیمایت کے اس مرحلے کو مارفومینیات کہتے ہیں۔صرف ونحو کی طرح یہ بھی قواعد کا جزو ہے۔

دیگر شاخیں

۱۔ لسانی جغرافیہ یا بولی جغرافیہ

اس شاخ میں مختلف بولیوں اور ان کے علاقوں کی تخصیص کی جاتی ہے۔

۲۔ جائزے کے طریقے

اس میں اس زبان کا مطالعہ کیا جاتا ہے جس میں تحریر موجود نہیں ہے اس شعبے کا کام ہے کہ ان اصولوں کو مرتب کیا جاتا ہے اور اس کے لیے صحیح نمونے حاصل کیے جاتے ہیں۔

۳۔ لسانی زمانیات

اس میں اعداد و شمار کی مدد سے کسی زبان کی عمر متعین کی جاتی ہے

۴۔ لسانی عتیقیات

اس میں قدیم زبانوں کی مدد سے قدیم تہذیبوں اور قبل تاریخ عصر کی تاریخ معلوم کی جاتی ہے۔یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ اطلاقی لسانیات کی شاخ ہے۔

۵۔تدوین اللغات

اس میں کسی زبان اور بالخصوص پچھڑی ہوئی زبان کے لغت کے اصول متعین کیے جاتے ہیں۔

۶۔لسانیاتی اسلوبیات

اس شاخ میں ہم کسی ادیب کے فن پارے کی زبان کا مطالعہ کرتے ہیں۔

۷۔ فرد بولی کا مطالعہ

اس شاخ میں ایک شخص کی بولی کا مطالعہ شروع سے آخر تک کیا جاتا ہے۔

لسانیات کی مختلف شاخوں کے تعلق کو ذیل کے خاکہ سے ظاہر کیا جاسکتا ہے:

لسانیات

یک زمانی یا تاریخی	متعلقہ شاخیں	دیگر شاخیں
معنیات صوتیات خالص لسانیاتی	نفسیاتی سماجی	لسانیات لسانیات
	لسانیات لسانیات اور ترسیل	اور ترجمہ

فونیمیات	مارفولوجی	نحو
تقابلی لسانیات	بولیوں کی لسانیات	اسلوبیات متنی تنقید[۳۶]

فونیم

صوتیہ کو کہتے ہیں اور فونیمکس کو تجزیاتی صوتیاتی یا تجصو تیاتی کہتے ہیں۔ اسے اردو میں فونیمیات ہی کہنا چاہیے۔

فونیمکس یا فونیمیات

وہ علم ہے جو کسی زبان کے فونیم دریافت اور متعین کرے اور اس کی ذیلی اقسام کا مطالعہ کرے۔ بعض فونیمکس کو فونالوجی بھی کہتے ہیں۔

صوتیات ہمیں ضروری اور غیر ضروری ہر قسم کی متعدد تفصیلات سے دوچار کر دیتی ہے۔ ہمیں ان سے سروکار رکھنا چاہیے جو مفہوم کی ترسیل میں اہم ہیں۔ بقیہ کو نظر انداز کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ فونیمیات یہی کام سرانجام دیتی ہے۔ یہ ایک آواز کی تمام ذیلی اصوات کو سمیٹ کر ایک گروہ میں رکھ دیتی ہے اور اسے فونیم کا نام دیتی ہے۔[۳۷]

حوالہ جات

۱۔ حامد اللہ ندوی، ڈاکٹر، اردو زبان کا تاریخی خاکہ مشمولہ اردو تاریخ و مسائل مرتبہ سید روح الامین، عزت اکادمی جگرات، ۲۰۰۷ء ص ۳۵

۲۔ شان الحق حقی، فرہنگ تلفظ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۹۵ء، ص ۸۱۸

۳۔ فیروز الدین، مولوی (مرتب)، فیروز اللغات، فیروز سنز لاہور، س ن، ص ۱۱۵۵

۴۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۱۵۶

۵۔ محی الدین قادری زور، ڈاکٹر، ہندوستانی لسانیات، مکتبہ معین الادب، لاہور، طبع سوم، ۱۹۶۱ء، ص ۲۱

۶۔ اقتدار حسین خان، لسانیات کے بنیادی اصول، ص ۱۱، ۱۲

۷۔ یونس خان ایڈووکیٹ، ساختیات، نشانیات اور پس ساختیات، مشمولہ جدید ادبی اور لسانی تحریکیں، دعا پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۱۴۷

۸۔ خلیل صدیقی، پروفیسر، لسانیات کیا ہے، مشمولہ اردو لسانیات کے زاویے مرتبہ سید روح الامین، عزت اکادمی گجرات، ۲۰۰۷ء، ص ۲۹

۹۔ اقتدار حسین خان، ڈاکٹر، لسانیات کے بنیادی اصول، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۸۵ء، ص ۱۵

۱۰۔ وقار عظیم، سید، پروفیسر، فورٹ ولیم کالج تحریک اور تاریخ، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۲۲، ۲۳

۱۱۔ عام لسانیات ص ۱۵، ۱۶

۱۲۔ گیان چند جین، عام لسانیات، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص ۲۶، ۲۷

۱۳۔ عین الحق فرید کوٹی، ص ۱۷ تا ۲۰

14-Linguistics,cox and wyman Ltd,Reading, Berkshire, London, England,2003 2nd Edition,page.26

۱۵۔ مسعود حسین خان، تاریخ زبان اردو، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۶ء، ص ۱۶، ۱۷

۱۶۔ عین الحق فرید کوٹی، اردو زبان کی قدیم تاریخ، ص ۲۰

۱۷۔ شکیل الرحمٰن، زبان اور کلچر، شاہین بکسٹال سرینگر کشمیر، ۱۹۵۸ء، مقدمہ ص ۹

۱۸۔ عین الحق فرید کوٹی، اردو زبان کی قدیم تاریخ، ص ۲۳

۱۹۔ مرزا خلیل احمد بیگ، اردو میں لسانی تحقیق، مشمولہ نقوش لاہور، شمارہ نمبر ۱۴۲، ص ۱۳۵

۲۰۔ عین الحق فریدکوٹی، اردو زبان کی قدیم تاریخ، ص ۲۴
۲۱۔ معین الدین عقیل، ایشیاٹک سوسائٹی، مشمولہ افکار کراچی، برطانیہ میں اردو نمبر، اپریل ۱۹۸۱ء، شمارہ ۱۳۳، ص ۱۳۱
۲۲۔ عین الحق فریدکوٹی، اردو زبان کی قدیم تاریخ، ص ۲۶ تا ۳۳
۲۳۔ افکار کراچی ''برطانیہ میں اردو ایڈیشن'' اپریل ۱۹۸۱ء شمارہ ۱۳۳، ص ۱۵۸
۲۴۔ خلیل احمد بیگ مرزا، ڈاکٹر، اردو میں لسانی تحقیق، نقوش لاہور، سالنامہ شمارہ ۱۴۲، ص ۱۰۵
۲۵۔ عطش درانی، اردو زبان اور یورپی اہل قلم، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور، س ن، ص ۱۹
۲۶۔ شہزاد منظر: آئینہ برطانیہ، افکار کراچی برطانیہ میں اردو نمبر، ص ۵۶۶
۲۷۔ ایس کے حسینی، ''اردو لغت نویسی اور اہل انگلستان''، افکار کراچی، ''برطانیہ میں اردو ایڈیشن'' اپریل ۱۹۸۱ء شمارہ ۱۳۳، ص ۱۵۹
۲۸۔ عبدالحق، مولوی، افکار کراچی ''برطانیہ میں اردو ایڈیشن'' اپریل ۱۹۸۱ء شمارہ ۱۳۳، ص ۲۰، ۲۱۔
۲۹۔ رضیہ نور محمد، ڈاکٹر، اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ، ص ۹
۳۰۔ عام لسانیات ص ۱۶
۳۱۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، ادبیات وشخصیات، ص ۱۴، پروگریسو بکس لاہور، ۱۹۹۳ء
۳۲۔ عزیز احمد: اردو زبان کا فروغ اور تحفظ، اخبار اردو اسلام آباد، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۵
۳۳۔ الٰہی بخش اختر اعوان، ڈاکٹر، معاشرے میں زبان کا کردار، مخزن ۷، بریڈفورڈ، ص ۵۷
۳۴۔ عام لسانیات، ص ۲۳ تا ۲۵
۳۵۔ الٰہی بخش اختر اعوان، ڈاکٹر، معاشرے میں زبان کا کردار، مخزن ۷، بریڈفورڈ (یو کے) ص ۶۳۔
۳۶۔ اقتدار حسین خاں، ڈاکٹر، لسانیات کے بنیادی اصول، ص ۱۸
۳۷۔ گیان چند جین، عام لسانیات۔

زبان، لسانیات اور تحقیق

لسانیات کا تعلق زبان کے مسائل اور مباحث سے ہے۔ زبان ادائے مطلب اور ترسیل وابلاغ کا مؤثر وسیلہ ہے۔ انسانی شخصیت کی تعمیر اور تہذیب وثقافت کی ارتقا پذیری میں زبان بنیادی کردار کی حامل ہوتی ہے۔ زبان دنیا بھر کے ہر خطے اور کونے کونے میں پائی جاتی ہے۔ کوئی نہ کوئی زبان کسی نہ کسی صورت میں ہر وقت صورت پذیری کے عمل سے گزر رہی ہوتی ہے۔ انسان ہمیشہ سے اپنی ذاتی اور اجتماعی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے دوسروں کا محتاج رہا ہے۔ نجی اور سماجی تقاضوں کے تحت انسان نے رابطے کے لیے زبان کی تخلیق کا عمل سرانجام دیا۔ زبان انسان کے ذہنی، فکری، جذباتی اور احساساتی تجربات اور تہذیبی رویوں کی ترجمان ہے۔ انسانوں نے ایک دوسرے سے ہم آہنگی پیدا کرنے اور معاشرتی نظام کو ایک نظم وضبط سے چلانے کے لیے زبان اور لسانی ارتقا کی تدریس کو مؤثر بنانے کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی ہے۔ زبان کی اہمیت کے حوالے سے خلیل صدیقی لکھتے ہیں:

''اگرچہ نجی اور سماجی تقاضوں نے انسان سے زبان تخلیق کرائی تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ زبان سماجی ارتقا کا وسیلہ بنتی رہی ہے۔ انسان کے تمام ذہنی وجذباتی تجربے زبان کے سانچوں میں ڈھلتے، روایات بنتے،

نکھرتے اور منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح انسان کی اجتماعی زندگی
میں تنظیم اور نکھار پیدا ہوتا رہتا ہے۔ انسان کے اس بیش بہا اکتساب نے
اس کی زندگی کے ہر پہلو اور ہر شعبے کو اپنا مرہون منت بنایا ہے۔ سماجی زندگی
کی کوئی سطح ایسی نہیں ہے جس میں زبان کا مسئلہ نہ چلتا ہو۔ سماج کی چھوٹی
سے چھوٹی اکائی ''گھرانے'' کے افراد بھی زبان کے وسیلے کے بغیر گھریلو
زندگی کو استوار اور مستحکم نہیں بنا سکتے۔ بچے کے اکتساب کا انحصار گھریلو زندگی
کی نوعیت اور خصوصیت پر ہوتا ہے۔''(۱)

زبان انسانی معاشرے کی پرداخت میں بنیادی اکائی کی حیثیت سے متعارف ہو چکی ہے۔ معاشرتی زندگی کو ہم زبان سے علیحدہ کر کے بالکل نہیں دیکھ سکتے۔ زبان سماجی سرگرمیوں میں ناگزیر کردار کی حامل ہے۔ زبان انسانی خیالات کو بہتر انداز میں دوسروں تک پہنچا سکتی ہے۔ زبان کی اسی اہمیت کی وجہ سے زبان کا علم اور لسانیات اپنی وسعت اور پیچیدگیوں کے سبب سائنس کی سی حیثیت حاصل کر چکی ہے۔ زبان کے مقام اور ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے ہر دور میں کچھ صاحب علم اور فہم و ادراک کے حامل افراد زبان کی تراش خراش اور اس کی بناوٹ و ساخت کے لیے سوچ بچار کرتے رہے ہیں۔ گویا لسانی تحقیق کی تاریخ اسی قدر قدیم ہے جتنی خود تاریخ بنی نوع انسانی۔

اردو میں ابتدائی لسانیات کے حوالے سے مستشرقین کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ڈچ، پرتگالی، فرانسیسی، جرمن، اطالوی اور انگریز دانشوروں نے اردو کے قواعد سے متعلق کتب مرتب کیں اور زبان کے اصول و جوابط پر تحریروں کو منظر عام پر لانے کا کارنامہ سرانجام دیا۔ ان مستشرقین کے ساتھ ساتھ مقامہ ماہرین علوم نے بھی اردو میں زبان ولسان کے حوالے سے قابل قدر تحقیقی کام کیا۔ سرسید احمد خان کا رسالہ قواعد اردو ''صرف ونحو اردو زبان'' بہت مشہور ہے۔ اس رسالے میں گرامر کے مختلف ابتدائی قاعدے درج ہیں۔ یہ غالباً ۱۸۴۰ء کے آس پاس کی تصنیف ہے کیوں کہ اس کتاب کے آخر میں یہی سن درج کیا گیا

ہے۔اس رسالے کے متعلق مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''اگر چہ یہ کتاب کچھ ایسی قابلِ لحاظ نہیں لیکن اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ مرحوم کو اردو زبان سے کس قدر دلچسپی تھی۔''(۲)

سر سید احمد خان نے اردو کے لیے ایک جامع قسم کی لغات کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اپنے عہد میں اردو لغات مرتب کرنے کا بیڑا اٹھایا۔انھوں نے اس لغات میں صرف مترادفات لکھ کر اس کا پیٹ بھرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ لفظ کی تعریف اور تشریح کو بھی لغات کا حصہ بنایا ہے بقول مولوی عبدالحق:

''یہ ایسا مشکل اور تحقیق کا کام ہے کہ اس زمانے میں بھی لغت کی جو کتابیں تالیف ہوئی ہیں وہ بھی اس سے عاری ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک شخص کا کام نہیں بلکہ اس کے لیے ایک جماعت کی متحدہ کوشش درکار ہے۔''(۳)

اردو میں لسانی تحقیق کا کام زیادہ تر قواعد نویسی ،لغت سازی، اصلاح زبان، اصطلاحات سازی اور زبان کے معیار کے بارے میں گفت وشنید پر مبنی رہا ہے۔یورپی مفکرین نے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق اردو میں لسانی کام سرانجام دیا۔ان کا اندز خالص محققانہ یا علمی نہیں تھا بلکہ سرسری اور روایتی سا تھا۔دراصل اردو زبان سے ان کی کوئی گہری وابستگی یا جذباتی لگاؤ والی کیفیت تھی نہ وہ اس زبان سے کوئی بڑا علمی وادبی اور فکری کارنامہ سرانجام دینا چاہتے تھے۔ان کا مقصد یہ بھی نہیں تھا کہ اس زبانمیں کوئی بڑا فن پارہ تحریر کیا جائے۔انھیں اس زبان سے دلچسپی تو تھی مگر اس دلچسپی کی نوعیت وہ نہیں تھی جو کسی اہل زبان کی ہوسکتی ہے۔ان ماہرین لسانیات نے اس لسانی فریضے کو انجام دینے کے لیے یورپی اور انگریزی زبانوں سے استفادہ کیا اور اظہار خیال کے لیے فارسی زبان کو بھی استعمال میں لایا گیا۔دلچسپ بات یہ ہے کہ اس دور میں اردو پر زیادہ تر لسانی تحقیقی کام دوسری زبانوں میں کیا گیا۔ان لوگوں کے لسانی کام سے اتنا ضرور ہوا کہ آنے والے محققین کے لیے ایک راستہ منتخب ہو گیا اور نو واردان تحقیق کو ایک واضح اور روشن راہ عمل نظر آنے لگا اور انھیں نسبتاً ایک ہموار اور کم دشوار گزار تحقیق کی وادی سے گزرنا پڑا۔ان مستشرقین، قواعد نگاروں اور لغات نگاروں نے جو لسانی خدمات

انجام دیں انھوں نے آگے چل کر لسانی تحقیق کو واضح خدوخال عطا کیے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب لکھتے ہیں:

''غیر اہلِ زبان کے لیے زبان کا سیکھنا قواعد کے بغیر بہت مشکل ہے۔اسی خیال کے پیش نظر ہندوستانی اردو زبان کی قواعد پر سب سے پہلے یورپی علماء نے توجہ کیوں کی کہ وہ اس زبان کو سیکھنا اور سکھانا چاہتے تھے ان میں سے بیشتر ایسے تھے جنھوں نے اردو زبان کے مزاج اور ساخت کو ہی پیش نظر رکھا۔اس کے برعکس ہندوستانی مصنّفین نے اردو قواعد کی جو کتابیں لکھیں ان میں عربی فارسی قواعد کی تقلید ملتی ہے۔مولوی فتح محمد خاں جالندھری کی ''مصباح القواعد'' اشاعت اول (۱۹۰۴ء مطبع رفاہ عام لاہور) بھی ان اثرات سے خالی نہیں۔انشاء اللہ خان انشاء نے البتہ فرسودہ روش سے ہٹ کر ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۷ء) میں اردو صرف ونحو کے اصول پر ''دریائے لطافت'' نامی کتاب فارسی میں لکھی تھی۔''(۴)

زبان کا علم ایک مبسوط اور جامع علم ہے مگر اس کی یہ جامعیت اور ہمہ گیری اس کی تغیر پذیری اور بدلتے ہوئے لسانی تقاضوں کی بدولت ہے۔زبان میں صرفی،نحوی، معنوی تبدیلیوں اور صوتی تغیرات کی کوئی باقاعدہ منطقی توجیہہ پیش نہیں کی جاسکتی۔لسانی محقق ان تمام تبدیلیوں اور صوتی تغیرات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے تحقیقی مواد کو ترتیب دیتا ہے۔ شعوری وغیر شعوری اور ارادی وغیر ارادی طور پر ہونے والے لسانی انحرافات کا مشاہدہ اور تجزیہ ایک لسانی محقق کے لیے بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔لسانی محقق اپنے لسانی تجزیے کی مدد سے ایک ہی زبان سے تعلق رکھنے والی مختلف بولیوں میں وقوع پذیر اختراعی اشتراک کو تلاش کر کے زبان کے ارتقائی مراحل ومنازل کا سراغ پیش کرتا ہے۔بقول خلیل صدیقی:

''بولیوں کے باہمی فرق وامتیاز کو تو ہم آسانی سے محسوس کر لیتے ہیں لیکن ہماری اپنی بولی یا زبان میں جو تغیرات ہوتے رہے ہیں انھیں نظر انداز کر دیتے ہیں یا محسوس نہیں کر پاتے۔ہم عموماً صوتی میڈیم یا اس کے اجزاء پر غور نہیں کرتے،ہمارا دھیان معانی ومطالب ہی کی طرف رہتا ہے۔

ہمارے نزدیک زبان اچھی خاصی مستقل حیثیت رکھتی ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ
ہم بالکل وہی زبان بول رہے ہیں جو ہمارے اجداد بولتے تھے۔ اس میں جو
بھی تصرفات ہو چکے ہوتے ہیں وہ ہماری نظر سے اوجھل ہی رہتے ہیں۔ یہ
درست ہے کہ جس دوران ہم اور ہماری نسل اسے بول چال یا تحریر میں استعمال
کر رہے ہوتے ہیں وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہی رہتے ہیں۔ یہ درست
ہے کہ جس دوران ہم اور ہماری نسل اسے بول چال یا تحریر میں استعمال کر رہے
ہوتے ہیں اس وقت اس کے اجزا کی حیثیت کم و بیش مستقل ہوتی ہے لیکن
لسانی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ زبان کے استقلال سے متعلق ہمارا تصور اجافی
ہوتا ہے۔ ایک دور کی زبان دوسرے دور کی زبان سے کچھ نہ کچھ مختلف ہو جاتی
ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اختلافات کی خلیج وسیع بھی ہو جاتی ہے۔''(۵)

اردو زبان اور لسانی تحقیق کو اپنی ارتقائی تشکیل میں جو ملکی اور غیر ملکی ماہرین قواعد ولغات میسر آئے انھوں نے نہایت مخلصانہ طور پر اردو زبان کو صحیح لسانی دھارا دینے کے لیے قابل قدر کوششیں کیں۔ ان ابتدائی کوششوں کو ہم کسی طور نظر انداز نہیں کر سکتے کیوں کہ اردو لسانیات کے جدید رویے اور نظریے اسی بنیاد کے سہارے قائم ہیں اور ان اصحاب لسانیات نے آنے والے محققین کے لیے ایک واضح لائحہ عمل مرتب کر کے کئی تحقیقی موشگافیوں کو حل کر دیا ہے۔ ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ لکھتے ہیں:

''یہ امر واقعہ ہے کہ اردو کی اولین قواعد یورپی عالموں کی ہی دین
ہے۔ انیسویں سدی کے وسط مین سر سید احمد خان، مولوی احمد علی دہلوی،
صہبائی اور مولوی کریم الدین کی اردو قواعد سے دلچسپی کا ذکر بھی اوپر آچکا ہے۔''(۶)

اردو میں لسانی مطالعہ و تحقیق کا جدی ددور بیسویں صدی سے تعلق رکھتا ہے۔ بیسویں صدی میں لسانی تحقیق اپنی ابتدائی ارتقائی حالت سے گزر کر ایک با قاعدہ علم کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس دور میں زبان کا مطالعہ مشاہداتی، تجزیاتی اور تجرباتی بنیادوں پر کیا گیا جب کہ انیسویں صدی کے لسانی مطالعہ میں یہ خصوصیات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ زبانوں کا

مطالعہ پہلے روایتی اور فرسودہ انداز مین کیا جاتا تھا۔ تاثراتی اور بیانیہ طریقۂ تحقیق کو بروئے کار لایا جاتا تھا۔ محققین کی نظر صرف مختلف علاقوں میں بولی جانے والی زبانوں اور لسانی تبدیلیوں پر مرکوز رہتی تھی اور مستند تحریر زبان کو ہی قرار دیا جاتا تھا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں مولوی عبدالحق کی تحقیقی خدمات قابل ذکر ہیں۔ ان سے صرف نظر ممکن نہیں۔ مولوی عبدالحق مولوی عبدالحق کی تصنیف کردہ ''قواعد اردو'' سب سے پہلے ۱۹۱۴ء میں الناظر پریس لکھنو سے انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔ اس قواعد کی کتاب کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی کیوں کہ اردو زبان میں یہ ایک خوبصورت اضافہ تھا۔ اس کتاب میں اردو کے صرف ونحو پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اجزائے کلام کی تمام اقسام کو تفصیلی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں قواعد اردو کے عربی و فارسی عناصر کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں مرزا خلیل احمد بیگ لکھتے ہیں:

> ''جہاں اردو کے ہندی عناصر کا بیان آیا ہے وہاں ان کے تاریخی ارتقا پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور قدیم ہندی، پراکرت اور سنسکرت میں ان کے مآخذ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس دور میں اردو قواعد اور اردو صرف ونحو کے مسائل پر کئی چھوٹے چھوٹے رسائل بھی لکھے گئے لیکن انھیں وہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جو مولوی عبدالحق کی ''قواعد اردو'' کو حاصل ہوئی۔''(۷)

اس کتاب میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اردو زبان کی ساخت اور مزاج کو مدنظر رکھتے ہوئے اصول وضوابط مرتب کیے۔ مولوی عبدالحق نے قواعد اردو مرتب کرتے ہوئے کسی ایک زبان کی قواعد کو نمونہ نہیں بنایا بلکہ انھوں نے اس سلسلے میں کئی زبانوں کی قواعد سے استفادہ کیا اور اردو زبان کی ایک علیحدہ قواعد مرتب کرنے کی کوشش کی۔ بقول ڈاکٹر شہاب الدین:

> ''مولوی عبدالحق کے قواعد اردو کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں دوسری زبانوں کے اصولوں کی کورانہ تقلید نہیں ملتی۔ اردو چونکہ ایک مخلوط زبان ہے اس لیے اس کی صرف ونحو کو عربی، فارسی اثرات سے بے نیاز نہیں رہ سکتی

لیکن اردو صرف ونحو کو عربی فارسی قواعد کے مطابق ڈھالا بھی نہیں جا سکتا۔
اردو زبان کی ساخت اور اس کے مزاج کے بارے میں مولوی عبدالحق نے
مستقل غور وخوض کے بعد اردو قواعد لکھی۔ ''(۸)

لسانیات زبان کے ارتقا اور لسانی تبدیلیوں سے بحث کے علم کو کہتے ہیں۔ جدید لسانیات کی منازل کیسے طے ہوئیں اور کوئی لسانی عنصر کس طرح مختلف زبانوں میں تبدیلی کے مراحل سے گزرتا ہے۔ ان باتوں کی نشاندہی لسانی تحقیق کا خاص موضوع ہوتی ہے۔ ایک لسانیات کے محقق کو زبان میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں اور زبان سے تعلق رکھنے والی بولیوں اور لہجوں پر گہری نظر رکھنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ اس زبان پر دوسری زبانوں کے اثرات کا جائزہ بھی لسانی تحقیق کا ایک اہم جزو ہے۔ اسی لیے لسانیات کے محقق کو ایک سے زیادہ زبانوں پر عبور حاصل کرنا چاہیے۔ لسانیات پر بحث کرتے ہوئے صوتیات، تجز صوتیات، تشکیلیات، نحویات، معنویات اور تکلمی آوازوں کا بھی محققانہ مطالعہ ومشاہدہ کیا جاتا ہے۔

لسانی تحقیق میں ماہر لسانیات نہ صرف زبان بلکہ وہ مقام یا ملک جس جگہ مذکورہ زبان بولی جاتی ہو اور وہاں کی خصوصیات، آب وہوا، موسموں کی تفصیل اور رسوم ورواج کا بھی گہرا مشاہدہ کرتا ہے۔ دراصل یہ تمام چیزیں کسی علاقے کے زبان وادب پر اثر انداز ہو کر تہذیبی وثقافتی روایات کی تعمیر کا فریضہ سرانجام دیتی ہیں۔ بقول رشید حسن خان:

> ''تحقیق میں ہر واقعہ بجائے خود ایک حیثیت رکھتا ہے اور اس کے متعلق ضروری معلومات حاصل کی جانی چاہئیں۔ ان معلومات سے کہاں، کس طرح اور کس قدر کام لیا جائے، یہ دوسری بات ہے اور اس کا تعلق ترتیب واقعات کے تقاضوں سے ہوگا۔ ''(۹)

لسانی تحقیق میں محقق کو ایسے اطلاع کار کی ضرورت ہوتی ہے جو اس مخصوص علاقے کا باشندہ ہو اور مفید معلومات فراہم کر سکتا ہو کیوں کہ محقق لسانی حالات کا بغور جائزہ لینے کے بعد ہی اپنی تحقیق کے لیے لسانی مواد حاصل کر سکتا ہے۔ کسی علاقے سے متعلق مخصوص مخطوطوں پر کام کرنے کے لیے محقق کو اس علاقے کے رسم الخط سے بھی آگاہی ہونی چاہیے۔ اس بارے

میں وہاں کے مقامی لوگوں کے علم اور یادداشت سے بھی کافی معلومات حاصل ہوسکتی ہیں کیوں کہ بہت سی باتیں سینہ در سینہ چلی آ رہی ہوتی ہیں۔ لسانی تحقیق کے حوالے سے محقق کے لیے یہ بات انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ وہ بیک وقت کئی اطلاع کاروں سے رابطہ رکھے جو مختلف عمروں اور مختلف پیشوں کے حامل ہوں تاکہ جہاں کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہوں وہیں ایک ہی واقعہ کی مختلف حوالوں سے تصدیق یا استناد ہو سکے۔

لسانی تحقیق ذخیرۂ الفاظ، مختلف فقروں اور جملوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ مختلف لوگوں کی آراء کو جمع کر کے ان کا موازنہ کرنا اور ان سے نتائج اخذ کرنا لسانی تحقیق میں بہت کارآمد ثابت ہوسکتا ہے۔ اس کے لیے سوالنامے اور انٹرویو کو بھی ذریعہ بنایا جا سکتا ہے لسانی محقق کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ایک سے زیادہ علوم میں مہارت رکھتا ہو کیوں کہ تقابلی لسانیات میں اس کی اہمیت کلیدی ہے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے بقول:

> ''ہماری لسانی تحقیق کو زمان اور مکان دونوں کے لحاظ سے صحیح ہونا چاہیے اور انسانی علوم کے مسلمات سے خلاف نہ ہونا چاہیے۔ الغرض لسانیات، انسانی علم کی ہر شاخ سے غذا حاصل کرتی ہے اور اس کے معاوضے میں ہر علم کو قوت پہنچاتی ہے۔ لسانیات ہی کے میدان میں پہنچ کر یہ حقیقت ہم پر پوری وضاحت اور درخشانی کے ساتھ منکشف ہوتی ہے کہ سب انسانی علوم آپس میں متداخل ہیں اور اسی تداخل کے وہ بارور ہوتے ہیں۔''(۱۰)

اب لسانیات کی قلمرو بہت وسیع ہو چکی ہے۔ اگر ہمیں کسی زبان کے حوالے سے لسانی تحقیق کا فریضہ سرانجام دینا ہو تو صرف اسی زبان کا علم ہماری ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کافی نہ ہوگا بلکہ اس مقصد کے لیے دوسری کئی زبانوں جن کا تعلق مذکورہ زبان سے بالواسطہ یا بلاواسطہ ہو، کو سمجھنا اور ان کا علم حاصل کرنا بھی نہایت ضروری ہے۔ ایک لسانی محقق کے لیے قدیم اور جدید زبانوں کے علم کا حصول ناگزیر ہے کیوں کہ اس کے بغیر وہ اپنا تحقیقی مواد منطقی ترتیب و ربط کے ساتھ پیش کرنے سے قاصر رہے گا۔

حوالہ جات

۱۔ خلیل صدیقی، زبان کیا ہے، بیکن بکس ملتان، ۱۹۸۹ء، ص ۴۳

۲۔ عبدالحق، مولوی، مقدمہ اردو قواعد، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دلی، ص ۲۶

۳۔ عبدالحق، مولوی، سرسید احمد خان (حالات و افکار) انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، ۱۹۵۹ء، ص ۱۶۲

۴۔ شہاب الدین ثاقب، ڈاکٹر، انجمن ترقی اردو ہند کی علمی و ادبی خدمات، ص ۲۶۶

۵۔ خلیل صدیقی، زبان کیا ہے، ص ۵۵، ۵۶

۶۔ خلیل احمد بیگ، مرزا، اردو میں لسانی تحقیق، مشمولہ نقوش لاہور سالنامہ ۱۹۹۶ء شمارہ ۱۴۲، ص ۹۸

۷۔ خلیل احمد بیگ، مرزا، اردو میں لسانی تحقیق، ص ۱۰۵

۸۔ شہاب الدین ثاقب، ڈاکٹر، انجمن ترقی اردو ہند کی علمی و ادبی خدمات، ص ۲۶۷

۹۔ رشید حسن خان، ڈاکٹر، ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، الفیصل ناشران و تاجران کتب، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۷

۱۰۔ عبدالستار صدیقی: دیباچہ، مشمولہ ہندوستانی لسانیات، طبع ثانی، مکتبہ معین الادب لاہور، ۱۹۵۰ء، ص ۷

☆☆☆

کتابیات

آزاد، محمد حسین: آب حیات مرتبہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۰ء

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی: کشاف تنقیدی اصطلاحات، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء

ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر: جامع القواعد، لاہور: مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۷۱ء

اخلاق حیدر آبادی، وقار پیروز، افضال احمد انور، ڈاکٹر، ہندی زبان: رسم الخط اور بنیادی معلومات، شعبۂ اُردو، جی۔سی۔یونیورسٹی، فیصل آباد، ۲۰۰۹ء

افسر صدیقی (مرتب): مثنوی نوسر ہار از اشرف بیابانی، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۲ء

اقتدار حسین خان، ڈاکٹر: لسانیات کے بنیادی اصول، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۵ء

الٰہی بخش اختر اعوان، ڈاکٹر: ہندکو صوتیات، پشاور: گندھارا ہندکو بورڈ پاکستان، ۲۰۰۴ء

امیر خسرو: غرۃ الکمال، دہلی: مطبع قیصریہ، س ن

انور سدید، ڈاکٹر: اردو ادب کی مختصر تاریخ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء

انیس ناگی: شعری لسانیات، لاہور: کتابیات، ۱۹۶۹ء

بابر، محمد ظہیر الدین: تزک بابری، اردو ترجمہ، جلد دوم، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۹ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر (مرتب): مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۳ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر (مرتب): دیوان حسن شوقی، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۱ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو جلد اول (قدیم دور) مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۵ء

روح الامین، سید (مرتب): اردو تاریخ و مسائل، گجرات: عزت اکادمی، ۲۰۰۷ء

حسن اختر ملک، ڈاکٹر: لسانیات کے زاویے، لاہور: یونیورسٹی بک ڈپو، ۱۹۷۹ء

خافی خاں: منتخب الباب، جلد سوم، کلکتہ: ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۹۲۵ء

خلیل احمد بیگ، مرزا: اردو زبان کی تاریخ، کلکتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۷ء

خلیل صدیقی: زبان کا ارتقا، کوئٹہ: زمرد پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء

خلیل صدیقی: زبان کیا ہے، ملتان: بیکن بکس، ۱۹۸۹ء

فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: اردو زبان و ادب، لاہور: الوقار پبلی کیشنز

رشید اختر ندوی: پاکستان کا قدیم رسم الخط اور زبان، اسلام آباد: قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت، ۱۹۹۵ء

رشید حسن خان، ڈاکٹر: ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، ۱۹۸۹ء

رضیہ نور محمد، ڈاکٹر: اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ، لاہور: مکتبہ خیابان ادب، ۱۹۸۵ء

سلیم اختر، ڈاکٹر: اردو زبان کیا ہے، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز

سلیم اختر، ڈاکٹر: اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، باردوم، ۲۰۰۲ء

سلیم فارانی، ڈاکٹر: اردو زبان اور اس کی تعلیم، لاہور: پاکستان بک سٹور، باردوم، ۱۹۶۲ء

سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو رسم الخط کے بنیادی مباحث، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۸ء

سہیل بخاری، ڈاکٹر: اردو کی زبان، لاہور: فضلی سنز لمیٹڈ، ۱۹۹۲ء

شان الحق حقی: فرہنگ تلفظ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۵ء

شان الحق حقی: فرہنگ تلفظ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان ۲۰۰۲ء

شان الحق حقی: لسانی مسائل ولطائف، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۶ء

شبیر علی کاظمی، سید: پراچین اُردو، کراچی: مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۲ء

شرف الدین اصلاحی: اردو سندھی کے لسانی روابط، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء

شکیل الرحمٰن: زبان اور کلچر، سرینگر کشمیر: شاہین بکسٹال، ۱۹۵۸ء

شمس اللہ قادری: اردوئے قدیم، کراچی: جنرل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۲ء

شوکت سبزواری: داستان زبان اردو، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۰ء

شوکت سبزواری، ڈاکٹر: لسانی مسائل، کراچی: مکتبہ اسلوب، ۱۹۶۲ء

شوکت سبزواری، ڈاکٹر: اردو لسانیات، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۳ء

شہاب الدین ثاقب، ڈاکٹر: انجمن ترقی اردو ہند کی علمی وادبی خدمات، دہلی: لیتھو کلر پرنٹنگ پریس، ۱۹۹۰ء

شیرانی، حافظ محمود: پنجاب میں اردو، حصہ اول، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۸ء

شیما مجید (مرتب): اردو رسم الخط، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۹ء

عبدالحق، مولوی (مرتب): خطبات گارساں دتاسی، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ص ۳۰۴

عبدالحق، مولوی (مرتب): قطب مشتری از ملا وجہی، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۵۳ء

عبدالحق، مولوی: اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیا کرام کا کام، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، بار چہارم، ۱۹۷۷ء
عبدالحق، مولوی: سرسید احمد خان (حالات وافکار)، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۵۹ء
عبدالحق، مولوی: اردو قواعد، نئی دلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، س ن
عتیق اللہ: ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ، جلد اول A تا D، دہلی: اردو مجلس، ۱۹۹۵ء
عرفان اشرف: ولی کا لسانی اور فنی شعور، دیوان ولی (انتخاب)، لاہور: میری لائبریری، ۱۹۶۵ء
عطش درانی: اردو زبان اور یورپی اہل قلم، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، س ن
عین الحق فرید کوٹی: اردو زبان کی قدیم تاریخ، لاہور: اورینٹ ریسرچ سنٹر، طبع سوم، ۱۹۸۸ء
فتح محمد خان، مولوی: مصباح القواعد، علی گڑھ: پی، سی، دوادش شرینی اینڈ کمپنی، ۱۹۳۸ء
فتح محمد ملک، پروفیسر، سید سردار احمد پیرزادہ، تجمل شاہ (مرتبین): پاکستان میں اردو، چوتھی جلد پنجاب، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۶ء
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: ادبیات وشخصیات، لاہور: پروگریسو بکس، ۱۹۹۳ء
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: اردو زبان وادب، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر (مرتب): اردو قومی یکجہتی اور پاکستان، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۲ء
قدرت نقوی، سید (مرتب): لسانی مقالات، حصہ اوّل، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۸ء
قدرت نقوی (مرتب): لسانی مقالات، حصہ دوم، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۸ء
قمر جمیل: جدید ادب کی سرحدیں، جلد اول، کراچی: مکتبہ دریافت ۲۰۰۰ء
کیفی، برج موہن دتا تریہ: کیفیہ، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، طبع دوم، ۱۹۵۰ء
گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر: اردو زبان اور لسانیات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء
گیان چند جین: عام لسانیات، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۵ء
محمد سلیم، سید، پروفیسر: اُردو رسم الخط، کراچی: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۱ء
محمد عسکری، مرزا (مترجم): تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ، کراچی: غضنفر اکیڈمی، س ن
محمد عوفی: لباب الالباب، جلد دوم، مطبوعہ کیمبرج، ۱۹۰۲ء
محی الدین قادری زور: دکنی ادب کی تاریخ، کراچی: اردو اکادمی سندھ، ۱۹۶۹ء
محی الدین قادری زور، ڈاکٹر: ہندوستانی لسانیات، لاہور: مکتبہ معین الادب، طبع سوم، ۱۹۶۱ء

مسعود حسین خاں، ڈاکٹر: تاریخ زبان اردو، لاہور: اردو مرکز، ۱۹۶۶ء

مظہر محمود شیرانی (مرتب): مقالات حافظ محمود شیرانی، لاہور: مجلس ترقی ادب، جلد اول، ۱۹۷۰ء

مہدی حسن: ابلاغ عام، مرکزی، لاہور: اردو بورڈ، ۱۹۶۸ء

میمن عبدالمجید سندھی، ڈاکٹر: لسانیات پاکستان، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۲ء

نصیر احمد خان، ڈاکٹر (مترجم): لسانیات کیا ہے از ڈیوڈ کرسٹل، لاہور: نگارشات ۱۹۹۷ء

نصیر احمد خان، ڈاکٹر (مترجم) ڈیوڈ کرسٹل، لسانیات کیا ہے، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، س ن

نصیر حسین خیال: داستان اردو، حیدر آباد (دکن): ادارہ اشاعت اردو، س ن

وزیر آغا، ڈاکٹر: اردو شاعری کا مزاج، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۳ء

وقار عظیم، سید، پروفیسر: فورٹ ولیم کالج تحریک اور تاریخ، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء

یونس خان ایڈووکیٹ: جدید ادبی اور لسانی تحریکیں، لاہور: دعا پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء

انگریزی کتب

Linguistics,cox and wyman Ltd,Reading, Berkshire, London, England,2003 2nd Edition

Turkish English Dictionary,H.C.Hony Oxford University Press 1967

The Story of Language by C. L. Barber, Cosmo Publications, New Dehli, 2007.

رسائل و جرائد، ڈائجسٹ

اخبارِ اُردو، ماہنامہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، مئی ۲۰۰۰

اخبار اردو، ماہنامہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، جون ۲۰۰۲ء

اخبار اردو، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، اگست ۲۰۰۴ء

اخبار اردو، ماہنامہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، اگست ۲۰۰۵ء

اخبارِ اُردو، ماہنامہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ستمبر ۲۰۰۸ء

اخبارِ اُردو، ماہنامہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، اکتوبر ۲۰۰۸ء

اخبارِ اُردو، ماہنامہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، دسمبر ۲۰۰۸ء

ادبیات، سہ ماہی، اکادمی ادبیات، اسلام آباد شمارہ ۵۷، ۲۰۰۲ء

اردو دنیا، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، انڈیا
افکار، ماہنامہ، کراچی، جولائی ۱۹۶۶ء
افکار، ماہنامہ، کراچی ''برطانیہ میں اردو ایڈیشن'' اپریل ۱۹۸۱ء شمارہ ۱۳۳
افکار، ماہنامہ، کراچی ماہنامہ، جنوری ۱۹۸۶ء
اوراق لاہور، شمارہ نمبر ۳، ۱۹۶۷ء
روحانی ڈائجسٹ دسمبر ۲۰۰۶ء
فنون لاہور، غالب نمبر، ۱۹۶۹ء
مخزن ۷، بریڈفورڈ (یوکے)، ۲۰۰۸ء
نقوش لاہور، شمارہ نمبر ۱۴۲
نگار کراچی، ماہنامہ، جولائی ۱۹۵۳ء
نگار کراچی، ماہنامہ، اگست ۱۹۵۴ء
نگار کراچی، ماہنامہ، اکتوبر ۱۹۵۴ء
نگار، کراچی، ماہنامہ، دسمبر ۱۹۵۴ء
نقوش لاہور سالنامہ ۱۹۹۶ء شمارہ ۱۴۲

لغات

اردو لغت جلد یازدہم، اردو لغت بورڈ کراچی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۹
عبدالحق، مولوی (مرتب) اردو انگریزی لغت، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، طبع پنجم، ۱۹۹۲ء
عبدالمجید، خواجہ بی اے، جامع اللغات جلد سوم، جامع اللغات کمپنی لاہور
فیروز الدین، مولوی (مرتب)، فیروز اللغات، فیروز سنز لاہور، س ن
نور الحسن، مولوی، نور اللغات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء